ہُوالعزیز الرّحیمؒ

یادِ رفتگان

یادِ آیام کہ از یاد نہ رفتند ہنوز
گرچہ ہفتاد بہاراں بہ خزاں پیوستند

از

خواجہ محمد عبدالمجید ٹیا محل دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

قیمت فی جلد ۱۲ر

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

فہرست مضامین

اس تحریر میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ صرف وہی واقعات تحریر ہوں
جو چشم دید ہیں۔ یوں تو ہر اسم گرامی کے ساتھ چند در چند واقعات لکھے
جاسکتے تھے۔ مگر وہ سب سماعی ہوتے۔ بعض کے لئے صحیح شہادت
بھی موجود ہے۔ تاہم قلم انداز کئے گئے۔ فقط۔

خواجہ محمد عبد المجید

یکم رجب المرجب سنہ ۱۳۶۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یادِ رفتگان

ہر چہ چشم دید افسانہ شدہ ✤ خواب خوش دیدیم و افسانہ شدیم

از خواجہ

میر محبوب علی پاشاہِ دکن

(۱)
فتح میدان میں فوجی کرتب

پچاس برس آنکھ بند کرتے گذر گئے۔ لورڈ الگن وائسرائے ہند کی آمد آمد ہے۔ چپّہ چپّہ پر دروازے بنے ہیں۔ نظر فریب۔ بالکل پختہ معلوم ہوتے ہیں۔ سڑکیں صاف۔ تنکے تک کا پتا نہیں۔ درختوں پر سرِ راہ چینی قندیلیں لٹک رہی ہیں۔ چار مینار۔ چار کمان۔ گلزار حوض۔ تنوار روشن۔ لال سبز گلاس لٹک رہے ہیں۔ سارا شہر دولہن بنا ہوا ہے۔ محلوں کے اندر کا حال خدا جانے۔ وہاں تک رسائی نہیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔

کوئی نئی بات نہیں۔ وائسرائے کی آمد پر یُونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ فتح میداں میں فوجی کرتب دکھائے جائیں گے۔ عام مخلوق بھی دیکھ سکتی ہے۔ نہ گولے کا ڈر۔ نہ بم کا خطرہ۔ شامیانے تنے۔ ڈیرے خیمے نصب ہوئے۔ حدِ فاصل چھوڑ کر رسیّاں بندھیں۔ اِدھر معزز مہمان اُدھر ہمہ شما۔

بندہ جوانِ رعنا۔ نیرہ چودہ برس کا سِن۔ دیکھنے دکھانے کے دن سازوسامان درست کر۔ گاڑی پر سوار ہو۔ اُدھر کا رُخ کیا۔ ارادہ یہ عامیوں میں گاڑی کھڑی کر اُس کی چھت پر چڑھ سیر دیکھ لیں گے۔ کوچبان سے غلطی ہوئی۔ گاڑی مہمانوں کے اترنے کی جگہ جا کھڑی کی۔ ہم بھی ہمت باندھ اندر داخل ہو گئے۔ پہرہ چوکی موجود۔ دعوت نامہ دیکھے کون۔ سب چوٹی کے آدمی آئیں گے۔ بات بات میں توہین ہو جاتی ہے۔ ہاں برزخ درست ہو پھر کوئی خطرہ نہیں۔ اندر امیر امراء کے پرے کے پرے کھڑے ہیں انگریز بھی ہیں ہندوستانی بھی۔ عورتیں بھی مرد بھی۔ دیسی عورتیں نہیں۔ بے پردگی عام نہ تھی۔

اطلاع یہ تھی۔ لاٹھ صاحب آئیں گے۔ لیڈی صاحبہ ساتھ نہیں ہوں گی۔ صدر شامیانہ میں صرف دو درباری کرسیاں رکھی ہیں۔ ایک معزز مہمان کے لئے دوسری میزبان کے لئے۔ باقی رسمی کرسیاں۔ وہ بھی

چند۔ کھڑے کھڑے تماشا دیکھو۔

اعلیٰحضرت تشریف لائے۔ پستہ قامت۔ گورا رنگ۔ چھریرا بدن۔ ڈاڑھی گلپھین۔ سر پر زرد دستار۔ اس پر مقیشی طرۂ امتیاز۔ بدن میں فروک کوٹ۔ از سر تا پا متانت اور وقار کی تصویر۔ جی چاہتا ہے۔ بلائیں لے لیجئے۔ کچھ دیر کھڑے رہے۔ اتنے میں لاٹھ صاحب کی سواری آ گئی۔

خلاف توقع لیڈی صاحبہ ہمراہ ہیں۔ ساتھ لے۔ تاجدار دکن شامیانہ میں داخل ہوئے۔ پیچھے آدمیوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ وہاں صرف دو امتیازی نشستیں۔ اب ہو تو کیا ہو۔ تینوں ہم پلہ۔ تینوں ہم مرتبہ بیٹھیں کیونکر۔ آواز پڑی کرسی لاؤ۔ چوبدار خیمہ میں سے کرسی لے کر چلا۔ بندۂ درگاہ نے اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ سب ایک طرف ہو گئے۔ لیجا قرینے سے لگا دی۔ خود پیچھے اڑے رہے۔

کرتب شروع ہوئے۔ اعلیٰحضرت نے قادر اندازی کے کرشمے دکھائے۔ بندوق ہاتھ میں لے لب فرش تک گئے۔ سامنے چوبدار بانس لئے کھڑا ہے۔ چٹکی سے اس کی سیدھ میں روپیہ اچھالا۔ اُدھر سے بندوق چلی۔ پھٹ سے روپیہ اُڑ گیا۔ بار ہا اڑایا ایک نشانہ بھی نام کو خطا نہیں گیا۔ بلا مبالغہ عرض ہے۔ بچپن کی آنکھ بھی روپیہ کو فضا میں دیکھنے سے قاصر تھی۔ پھر وقار الامراء وزیر دکن نے بندوق سنبھالی۔ نشانے

لگے بھی خطا بھی ہوئے۔ افسر جنگ افسر الملک بھی ایسے ہی سے رہے اور پیشکار بہادر علیٰ ہذا القیاس۔

اب دوسرے طرز پر نشانہ بازی شروع ہوئی۔ سامنے ایک دیوار ہے۔ اس پر بوتل لٹکائی جاتی ہے۔ اُس کو گردش میں لاتے ہیں اور نشانہ لگاتے ہیں۔ اس آزمائش میں بھی حضور پُرنور اول نمبر۔ باقی پھسڈی۔ یوں تو سب کچھ مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

اب نیزہ بازی کی باری آئی۔ خود بدولت۔ میانہ قد۔ گلدار سبزہ پر سوار ہوئے۔ خلقت نے ولی نعمت کو دیکھ کر جوشِ نظّارہ میں ہجوم کیا۔ رسّی ٹوٹ گئی۔ لوگ آگے نکل آئے۔ پولیس نے تشدّد کیا۔ اُن کو اشارہ سے روک دیا۔ خود سوار آگے بڑھے۔ رعیت کے حال پر شفقت روئیں روئیں سے ٹپک رہی تھی۔ نہایت متانت اور آہستگی سے سب کو ہٹا دیا۔ رسّی درست کر دی گئی۔ کرتب جاری ہو گئے۔ زیادہ عرض کرنا فضول۔ فوجی نوجوانوں نے اپنے ہنر دکھائے اور نمائش ختم ہو گئی۔ خدا ایسے سرداروں کی رُوح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

یاد ایام کہ از یاد نہ رفتند ہنوز + گرچہ ہفتاد بہاراں بہ خزاں پیوستند
(راز خواجہ)

میر تراب علی خان سر سالار جنگ اوّل

(۲)
ایک ڈنر

چھ برس کا بچّہ آج پینسٹھ برس کا بڈھا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں تعجب تو یہ ہے۔ واقعات یاد کیسے ہیں۔ یاد ہی نہیں۔ اس وقت پیش نظر ہیں۔ ایک منظر کے بعد دوسرے منظر کا پردہ الٹ رہا ہے۔

سُنئے۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں۔ میرے چچا۔ حقیقی نہیں۔ باوا کے سگے پھوپی زاد بھائی۔ سر سالار جنگ اوّل کے مستند بلکہ معتمد علیہ۔ راز دار۔ مُقرب۔ مُشیر کار۔ یہ خاکسار سایہ وار رات دن اُن کے ساتھ۔ ماں باپ کا اکلوتا۔ دونوں زندہ۔ خوش حال۔ پرورش کے لئے چچا باوا (عنایت الرحمٰن خاں) کا کنف عاطفت۔ وہ بھی صاحب اولاد۔ اولاد دہلی میں۔ خود حیدرآباد میں۔ بچّوں کے دلدادہ۔ میں بچّہ۔ خوبصورت بچّہ۔ شائستہ بچّہ۔ اُن کا بچّہ۔ ہمہ وقت اُن کے ساتھ۔

موسلا دھار مینھ پڑ رہا ہے۔ سر سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں ڈنر ہے

سرکاری ڈنر ہے۔ صاحب عالی شان (رزیڈنٹ) کو دیا گیا ہے۔ ہماری گاڑی جلوخانہ کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ آئینہ خانہ کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ یہاں Portico نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس کا رواج ہی نہ تھا۔ گاڑی سے اُتر ایک چھلانگ مار دروازہ میں داخل۔ اندر راستہ سقف پوش۔ مکان آئینہ خانہ۔ در و دیوار پر محدّب ہشت پہل آئینہ چسپاں۔ وسطِ صحن میں حوض۔ پانی سے لبریز۔ بچ پرس کی عورت کھڑی نہا رہی ہے۔ سر پہ فوارہ چھٹ رہا۔ اوپر بجلی کا ہنڈا لگا ہوا۔ بجلی Arc light یا carbon light۔ آنکھ کھول کر آج ہی بجلی کی روشنی دیکھی ہے۔ بیٹھ میں عجیب بہار دے رہی ہے۔ آئینوں پر آب در آب کا عکس۔ بجلی کی شعاؤں سے بجلیاں کوند رہی ہیں۔ ایک جانب چینی خانہ۔ سچی چینی کے برتن۔ چھت سے لے کر زمین تک آویزاں۔ نگارخانہ چین۔ چہل چراغ۔ دیوارگیریاں روشن۔ مگر شمع زرد رُو۔ بجلی جوبن پر ہے۔

سارا مکان مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ صاحبان انگریز۔ اہلِ قلم۔ اہلِ سیف۔ لباس شاہدِ حال۔ لیڈیاں پاکیزہ ادا۔ بر و دوش برہنہ۔ یہ زیادہ دیسی کم۔ صرف اعلیٰ عہدیدار مدعو ہیں۔ ایک طرف مجھ سے قریب مفتی صاحب کھڑے ہیں۔ نام یاد نہیں۔ سر پر سفید دستار۔ سیاہ چغہ۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ پوش۔ پاؤں میں جوتا انگریزی۔

سامنے سے میزبان صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ بلند قامت۔ گورا رنگ۔ مگر پھیکا شلغم۔ سُرخی کا پتہ نہیں۔ عمر کا اقتضیٰ۔ بدن بھرا ہوا۔ داڑھی صاف۔ مونچھیں بڑی بڑی۔ سفید دستار۔ کالی شیروانی۔ سینہ پر ستارہ ہند کا تمغہ جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ واہ کیا ہیرے ہیں۔

چلتے جاتے ہیں مہمانوں سے باتیں کرتے جاتے ہیں۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں کے پاس آکر ٹھٹک گئے۔ مولوی صاحب یہ کس انگریز کا بچہ آپ کے ساتھ ہے۔ سرکار میرا بھتیجا ہے۔ دم بھر کو نہیں چھوڑتا بہت ہلا ہوا ہے۔ آپ نے اس کو انگریز بنا رکھا ہے۔ سرکار مانتا ہی نہیں۔ انگریزی لباس کے سوا اور لباس پہنتا ہی نہیں۔ سالار جنگ مسکرائے۔ گلوں پر ہاتھ پھیرا۔ آگے بڑھ گئے۔ یہ گفتگو مجھے یاد نہیں۔ بعد میں چچا باوا نے سنائی ہے۔

مہمان ڈنر پر جا رہے ہیں۔ اندر ہی اندر دوسرے مکان کو راستہ جاتا ہے۔ بہت بڑے دالان ہیں۔ یہاں بجلی کی روشنی نہیں۔ وہ تو بس آئینہ خانہ ہی میں تھی۔ میزیں سجی ہوئیں۔ سب اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ہم بیراؤں کے حوالے کر دیئے گئے۔

میزوں کے بائیں میں ایک خالی کرسی پر لیجا بٹھایا۔ کھانے انواع و اقسام کے موجود۔ مگر ہم تو آئس کریم کے شوقین جب آئے گی کھائیں گے۔

بڑی بڑی ڈشوں میں چرچ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ کوئی ہلکی زرد۔ کوئی سفید۔ کوئی گلابی آنی شروع ہوئی۔ ہم کھانے لگے۔

اب بارش تھم گئی۔ کھانا ختم ہوا۔ سب پائین باغ کو روانہ ہوئے یہاں آتش بازی چھٹی۔ سرکاری آتش باز کی بنائی ہوئی۔ یہ فرانسیسی خاندان ہے پشتوں سے نوکر چلا آتا ہے۔ اس نمود بے بود میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو یاد رہ جاتی۔

آگے پائین باغ میں عارضی Theatre بنا ہوا ہے یہاں پارسی کمپنی تماشا کرے گی۔ سب وہاں چلے گئے۔ یہ پہلا تماشا ہے جو ہم نے اپنی عمر میں دیکھا۔ اِس سے پہلے کوئی ناٹک نہیں دیکھا تھا۔ ہوائی مجلس تھی۔ ہاتھوں میں کنٹر، گلے میں گجرے۔ پریاں اُدھر کھڑی ناچ رہی ہیں۔ ہوائی مجلس بارہا ہوئی۔ پھر کبھی نہیں دیکھی۔ قصہ خدا معلوم کیا ہے۔

ہم کھوئے گئے۔ مہدی علی خان (بعد میں محسن الملک) کے پاس ایک کرسی پر جا براجے۔ اُنہوں نے پوچھا۔ نام کیا ہے؟ کہا مجید۔ کس کے ساتھ آئے ہو؟ چچا باوا کے ساتھ۔ اُن کی بلا جلنے چچا باوا کون۔ آخر ایک چپراسی آیا اور پکڑ کر لے گیا۔ جلسہ ختم ہوا۔ مہمان رخصت ہوئے۔ لطف یہ کہ سارے مجمع میں مَیں ایک بچّہ۔ باقی سب معمّر۔ یہاں بچّوں کا کام ہی کیا تھا۔ یہ تو عنایت الرحمٰن خاں ہی کا بچہ تھا جو گھُسا چلا گیا۔ پھر اس گھر میں

گذر نہیں ہوا۔ اللہ گھر کو بنائے رکھے۔

ڈنیا بدل گئی۔ نقشہ پلٹ گیا۔ مہماں نواز مر گیا۔ معتمد پر اعتماد نہ رہا۔ میر لائق علی خان عماد السلطنت مدار المہام ہوئے۔ دوسرے برسرکار آئے۔ بعید قریب ہو گئے اور قریب بعید۔
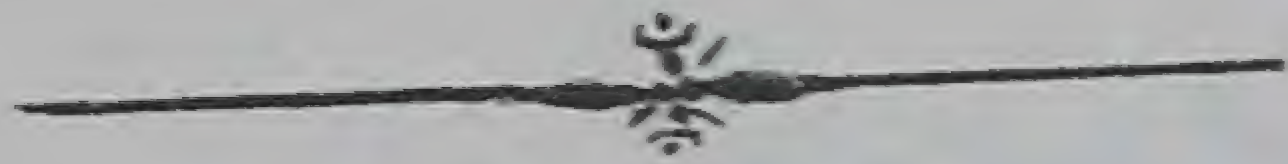
میر لائق علی خان عماد السلطنت سالار جنگ ثانی

(۳)

اگر ان کی ایک استغنی کی ادا دل کو نہ بھا جاتی۔ تو آج زبانِ قلم پر ان کا نام نہ آتا۔

نظام کے مشکوئے معلّٰی میں ولی عہد بہادر تولد ہوئے۔ زیادہ عمر لکھوا کر نہیں لائے تھے۔ صغیر سن فوت ہو گئے۔ قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے۔ گہوارہ مدار المہام وقت گزرانتا ہے۔ مدار المہام عماد السلطنت ہیں۔ یہ گہوارہ لے کر حاضر ہونگے۔ دیوانی کے عہدہ دار جلوس میں شریک ہونگے یہ سب نہیں اعلیٰ مرتبہ۔ ہمارے والد اعلیٰ مرتبہ نہیں۔ تاہم اس فہرست میں ہیں۔ اپنی عادت کے خلاف ہم کو ساتھ لے گئے۔ ہم ناخواندہ مہمان ہیں۔

جلوخانہ میں سواری سے اترے۔ پائین باغ سے گذر کر۔ دیوانخانہ میں داخل ہوئے۔ عالی شان عمارت ہے۔ نئی بات یہ ہے۔ جانشین اور شاہ نشین دونوں موجود۔ دوسرے مکانوں میں اگر شاہ نشین ہے۔ تو جانشین نہیں۔ سارے مہمان زرق برق لباس میں صف بستہ کھڑے ہیں۔ مدار المہام بہادر کے برآمد ہونے کا انتظار ہے۔ وہ شاہ نشین سے اترے چلے آرہے ہیں۔ چال مستانہ۔ بلند بالا۔ بدن بھاری۔ رنگ

گورا۔ آب موتی کی سی۔ سر پر موتی کے رنگ کی دستار۔ اس پر موتیوں کا سرپیچ۔ بدن میں پیازی کمخواب کی اچکن۔ گلے میں ست لڑا۔ بازوبند دست بند۔ سب زیور موتیوں کا۔ کسی نگ کا پتا نہیں۔ بڑے سے بڑا موتی ریٹھے کی گولی کے برابر۔ سب خوش آب۔ خوش رنگ۔ سڈول کمخواب کا عکس موتیوں کو پیازی کئے دیتا ہے۔ اُن کا حسن دوبالا ہو رہا ہے۔ آج کے دن زیور پہننا ضروری ہے۔ پہنے ہوئے ہیں۔ معمولاً امراء کے ہاں یہ رواج نہیں۔

باہر کے دالان تک آ گئے۔ ست لڑے کی ایک لڑ ٹوٹ گئی۔ موتی پٹاپٹ گرنے شروع ہوئے۔ کان میں آواز آئی۔ ٹوٹی ہوئی لڑ ٹٹولی۔ نوچ کر وہیں پھینک دی۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ آگے بڑھے چلے گئے۔ اللہ رے استغنے۔ چوبداروں نے اٹھا لئے ہوں گے۔ اگر کسی کا پاؤں پڑ گیا ہو گا۔ دو چار ٹوٹ بھی گئے ہوں گے۔

یہ آگے آگے اور ساری برات پیچھے پیچھے۔ پائین باغ میں پہنچ گئے یہاں مہمانوں کے لئے ہاتھی حاضر ہیں۔ سب پر ہودے کسے ہوئے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوئے۔ جلوس بن کر تیار ہو گیا۔ سب سے آگے فوج فرا۔ باجا گاجا اُس کے پیچھے گنگا جمنی گھوارہ پھر خود بدولت کا ہاتھی۔ اتنے میں چوبدار چھڑیوں کے ڈھیر لئے آن موجود ہوئے۔ ایک ایک چھڑی سب کو بٹ گئی۔

ایک ہم کو بھی مل گئی۔ یہ مہمانوں کی آرائش ہے۔ شاید یہی دستور ہوگا۔ چھڑی بانس کی کھپچی۔ اس پر سنگین روپہلی ٹھپّہ لپٹا ہوا۔ نیچے مقیشی پھندنا بڑی انوٹ کی چیز ہے۔

جلوس چار مینار سے ہوتا ہوا۔ چو محلہ مبارک میں داخل ہوا۔ سب جلوخانہ میں ہاتھیوں پر سے اتر گئے۔ دیوانِ عام میں جاکر کھڑے ہوگئے۔ بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ گہوارہ محل میں داخل ہوگیا۔ کشتی میں نذر۔ کشتی پر کشتی پوش پڑا ہے۔ اندر معلوم نہیں کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چوبدار آئے۔ پان دان ساتھ لائے۔ پان دان چاندی کے ہیں۔ خاصے بڑے۔ کتابی۔ قند کی بستنیوں میں بندھے ہوئے۔ روپہلی ڈھنک لگی ہوئی۔ اندر خانے بنے ہوئے ہیں۔ جوز۔ جوتری۔ لونگ۔ الائچی۔ چکنی ڈلی۔ الگ الگ خانوں میں رکھی ہیں۔ ایک خانہ میں عطر کی دو قلمیں ہیں۔ سب کے اوپر صافی میں بھیگی پان دھرے ہیں۔ ہر ایک کو پان دان مل گیا۔ گلوں میں گجرے ڈالے گئے۔ گجرا ہمارے تو گھٹنوں سے بھی نیچا تھا۔ گیارہ برس کے بچّے کی بساط ہی کیا۔ یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں۔ میرے سوا اس مجمع میں دوسرا بچّہ نہ تھا۔ اجازت عطا ہوئی۔ رخصت ہوئے۔ دیوان کی ڈیوڑھی تک ہاتھیوں پر آئے۔ یہاں سے اتر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔

سرسیّد احمد خان بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ

(۴)

گرمیوں کا آغاز ہے۔ دھوپ میں تیزی آتی چلی ہے۔ باوا اور چچا باوا (مولوی عبدالرحیم خان اور مولوی عنایت الرحمٰن خان) رخصت پر دہلی آئے ہوئے ہیں۔

ایک دن صبح کے وقت چچا باوا آن کھڑے ہوئے۔ مجھ سے کہا چل علی گڑھ چلیں گے۔ اُن کے ساتھ اُن کے چھوٹے صاحبزادہ ابوالحسن خان بھی ہیں۔ یہ مجھ سے ڈھائی برس بڑے ہیں۔ میں اس وقت کوئی گیارہ برس کا ہوں۔ ہم روانہ ہو گئے۔ وہاں سرسیّد سے ملیں گے۔

پہلے سرسیّد سے عنایت الرحمٰن خان کے تعلقات بیان کر دوں۔ بات صاف ہو جائے۔ مولوی محمد تقی خان اُن کے سگے ماموں۔ میرے دادا۔ سرسیّد کے ہم درس۔ دونوں بھوجلا پہاڑی کی اپلی والی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ پھر سرسیّد مفتی صدرالدین خان صدر صدورِ دہلی کے شاگرد۔ عنایت الرحمٰن خان اُن کے گھر کے آدمی۔ رات دن کا ملنا جلنا تھا۔ تعلق اور مستحکم ہو گیا۔ ہمارا سارا خاندان سرسیّد کی ادا کا پیرو۔ مگر اُن سے منحرف۔ بُرا کہتے ہیں۔ کیڑے ڈالتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں۔ بغض للّٰہی۔ تاہم مخالفت نہیں کرتے۔ خاندانی روابط میں فرق نہیں۔ ایک دوسرے کی عزت

آبرو گرنا ہے۔

غرض علی گڑھ جا اُترے۔ سیج گاڑی کر۔ سرسید کی کوٹھی روانہ ہوئے۔ کوٹھی کا Compound. وسیع۔ کوٹھی خس پوش۔ خاصی بڑی۔ Compound میں کتے پڑے لوٹ رہے ہیں۔ گُل بُوٹے کا نام نشان نہیں۔ اطلاع ہوئی۔ اندر بلائے گئے۔ ایک خاصے لمبے چوڑے کمرہ میں داخلہ ہوا۔ فراشی پنکھا کھنچ رہا ہے۔ دو چار معمولی کرسیاں پڑی ہیں۔ سامنے دفتری میز لگی ہوئی ہے۔ اُس کے آگے کرسی نہیں چوکی بچھی ہوئی۔ اُس پر سفید گبھا۔ پیچھے گاؤ تکیہ۔ ایک پیر مرد آلتی پالتی مارے تشریف فرما ہیں۔ ہاتھ میں قلم ہے۔ واسطین نہیں ڈنک۔ کچھ لکھ رہے ہیں۔ اس زمانہ میں اردو نیزے کی قلم سے لکھی جاتی تھی۔ یہ نئی بات ہے۔

اِن کی ہیئت کذائی سُنئے۔ سر پر برشی بال۔ ڈاڑھی چھاج سی۔ رنگ گورا۔ نقشہ بھدا بھدا۔ تن و توش اللہ اکبر۔ سر سے پاؤں تک بُقعۂ نور۔ سفید کرتہ زیب تن۔ ننگے سر۔ یہ معلوم ہوتا ہے ابھی نہا کر اُٹھے ہیں۔

ہم کو دیکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ کوئی پاؤ گھنٹہ بات چیت ہوتی رہی۔ گفتگو رسمی تھی۔ ایسا کوئی پہلو نہ تھا جو یاد رہے۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں نے جسٹس محمود سے ملنے کو کہا۔ یہ اِن کے

سانٹھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ سر سیّد نے گھنٹی بجائی۔ نوکر آن موجود ہوا مسٹر محمود کے پاس پیغام لے کر گیا۔ اس کمرہ کے مغرب میں ایک بڑا دروازہ ہے یہ کوٹھی کے Sitting room میں کھلتا ہے۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا scream لگا ہوا ہے۔ کارِ نجاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جسٹس محمود یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ پنکھا لگا ہوا ہے۔ کچھ نہیں رہا۔ سُنا ہے اُن کو پنکھے سے نفرت تھی۔ کئی سوفا بچھے ہوئے ہیں۔ کرسی کوئی نہیں۔ صدر میں مسٹر محمود بیٹھے ہیں۔ سامنے چھوٹی سی میز دھری ہے۔ ایک اور صاحب بھی ہیں۔ یاد نہیں۔ کون تھے۔ گفتگو اس پر ہو رہی ہے۔ انگلستان کی بہبودی کی بنیاد کوئلے کی کانوں پر منحصر ہے۔ ان کانوں میں اب اتنے ٹن کوئلہ باقی رہ گیا ہے۔ اتنے سال میں ختم ہو جائیگا پھر انگلستان ختم۔ سارے اعداد و شمار بیان ہو رہے ہیں۔ ہر بات خطبی طور پر کہی جا رہی ہے۔ کوئی بیس منٹ یہ صحبت رہی۔ اس کے سوا کوئی ذکر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مزاج پرسی کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اب تعجب ہوتا ہے اس گفتگو نے اتنا طول کیسے کھینچا۔ مگر کھنچا۔ وہ دو قدح تو ہوا نہیں۔ وہی فرماتے رہے۔ آخر اس گفتگو سے عاجز آ کر رخصت ہوئے۔ دل پر یہ نقش لے کر آئے۔ ہائے ایسے عالی قدر انسان کے دماغ کا توازن خراب ہو چکا ہے۔ دونوں جگہ مہمانوں کی کوئی تواضع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر ڈپٹی نذیر احمد

(۵)
کتابیں تصنیف ہوری ہیں - ہم بچے ہیں - خود نہیں پڑھ سکتے - باوا پڑھتے ہیں - ہم سُن لیتے ہیں - پھر خود پڑھنے کے قابل ہو گئے - کوئی کتاب نہیں چھوڑی - ہر کتاب دو دو تین تین دفعہ پڑھی - سمجھیں یا نہ سمجھیں پڑھنا ضرور - اِدھر کتاب چھپی اُدھر آن موجود ہوئی - باوا نے انتظام کر رکھا ہے - دیدار نا ممکن - ہم دکن میں بستے ہیں - کبھی کبھار دہلی آجاتے ہیں وہ بھی مہینہ دو مہینہ کے لئے - بزرگوں کی ان سے شناسائی ہے - روابط نہیں - نہ ہمارے ہاں سے کوئی وہاں جائے، نہ وہ تشریف لائیں - دیدار ہو تو کیونکر ہو -

ہم کبھی دہلی آتے ہوئے ہیں اور عظیم الدین ترمزی بھی یہ ہمارے ساتھ کے پڑھے ہوئے، ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں - ان کے باوا بیمار ہیں - مفلوج ہو گئے ہیں - حکیم عبد المجید خاں کے زیرِ علاج ہیں - آج کل ہندوستان میں ان کا طوطی بول رہا ہے - نام فخر الدین ترمزی ہے - بیٹے کی تعلیم کا بہت خیال ہے - کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے - مگر صاحبزادہ نے کچھ پڑھ کر دیا ہے نہ دیں گے - اب تو یہ صاحب بڑے سیّاح ہیں - بحر و بر کے چکّر لگائے ہیں - یورپ کا پھیرا

مار چکے ہیں۔ مگر سب خوش گذرانی کے سلسلے میں۔ شعر۔

مکہ گیا مدینہ گیا کربلا گیا ٭ جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

دہلی میں ان کو مشن اسکول میں داخل کر دیا ہے۔ ڈپٹی صاحب سے حیدرآباد کے روابط ہیں۔ عربی پڑھنے کو اُن کی خدمت میں بھیج رکھا ہے

تو کار زمیں را نکو ساختی ٭ کہ بہ آسماں نیز پرداختی

اردو اور انگریزی ہی پڑھ جائیں تو غنیمت ہے۔ عربی تو لوہے کے چنے ہیں۔ غرض ڈپٹی صاحب کی نسبت روز ان سے تذکرے ہوتے ہیں۔ یہ واردات بیان کرتے ہیں۔ سب سماعی ہیں۔ تحریر کی گنجائش نہیں۔ اب ہم کو اُن کے عادات وخصائل سے بھی کچھ واقفیت ہو گئی۔ حاضری کی نوبت نہ اب آئی نہ آئندہ کبھی آئے گی۔ ابھی تو صورت دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوئی۔

اب ہم دائمی طور پر دہلی آبسے ہیں۔ والد کی پنشن ہو گئی ہے۔ اب ان کو دیکھیں پر دیکھیں۔ ہم چاندنی چوک میں گزر رہے ہیں گھنٹہ گھر کے پاس ہیں۔ وہ چاندنی چوک۔ اب کا سا چاندنی چوک نہیں۔ دونوں جانب سڑک ہے۔ بیچ میں پٹری۔ گھنے درخت چھائے ہوئے ہیں۔ سامنے سے ڈپٹی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے شام ہوئی گھر سے نکل پڑے۔ اب دہلی لائبریری میں جائیں گے۔ گھنٹہ دو گھنٹے کی

نشست ہوگی۔ منشی ذکار اللہ اور ماسٹر پیارے لعل بھی یہاں ہوں گے۔ اخبار بینی ہوگی۔ گپ شپ لڑیگی ۔ اندھیرا ہوتے اپنے اپنے گھروں کو چل دیں گے۔

میانہ قامت ہیں۔ رنگ گندمی ہے۔ سیاہی کا عنصر اس میں غالب۔ فربہ اندام۔ آنکھیں قدرے چھوٹی۔ ذہانت پر دال۔ کشادہ پیشانی۔ اقبال مندی کی دلیل۔ ناک پکوڑا سی۔ ڈاڑھی یک مشت تو ضرور۔ دو انگشت کی بابت کہا نہیں جا سکتا۔ بڑے کھلنڈے کے آدمی ہیں۔ آواز بھاری اور پاٹ دار۔ ہزار آدمی سن لیں۔ ہر ایک سمجھے کہ اُسی کے کان میں۔ کھڑے بول رہے ہیں۔ سفید شیروانی۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکا خوش رُو نازک اندام۔ بدن میں لمبا سا کرتہ اوپر صدری۔ سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔ بارہ تیرہ برس کا سن۔ یہ ہمارے سر عبدالرحمٰن ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ڈپٹی صاحب اور ان کے والد میں تجارتی تعلقات ہیں گھنٹوں ان کی دوکان پر آکر بیٹھتے ہیں۔ حساب کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ باوا نے تعلیم اور تربیت کی غرض سے بیٹے کو ان کے سپرد کر دیا ہے۔ انہی کی صحبت کا اثر ہے۔ جو آج وہ کچھ سے کچھ بن گئے ہیں۔

طبیہ اسکول قائم ہے۔ بانی حکیم عبدالمجید خاں ہیں۔ سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ دیوان خانہ میں۔ صدر دالان کے سامنے شامیانہ تنا ہوا ہے۔

میز کرسی کی نشست ہے۔ ہم بھی حاضر ہیں۔ کرسیاں کم آدمی زیادہ ہم کھڑے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کا لکچر میں گے۔ لکچر ہوا اور خوب ہوا۔ بلا مبالغہ عرض ہے دل یہ چاہتا تھا کہ یہ تو تقریر کو ختم ہی نہ کریں۔ فقرہ فقرہ ایک مرصّع شعر تھا۔ اگر کانوں کی جنت کہئے تو زیبا ہے۔ لکچر کے بعد ایک نظم پڑھی۔ طب کے موضوع پر تھی۔ وہ چھپ گئی ہے۔ مولوی اور شاعری کچھ بے تکی سی بات ہے۔ بس سمجھ لیجئے۔

اور سنئے۔ مشن کالج میں سالانہ جلسہ ہے۔ ہم بھی موجود ہیں۔ یاد نہیں صدر کون تھا۔ ڈپٹی صاحب مہمانوں کی اول صف میں تشریف فرما ہیں۔ صدر کے شکریہ کا ووٹ ان کے سپرد ہوا۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ سبحان اللہ۔ کیا تقریر تھی۔ مگر مختصر۔ بیان کیا کہ سرکار انگریزی ایک مگرمچھ ہے۔ اور اس کی دو مونچھیں ہیں۔ ایک تجارت دوسری پادری۔ جس سرزمین پر تسلط کا ارادہ ہوتا ہے۔ پہلے وہاں یہ دو مونچھیں جا موجود ہوتی ہیں پھر مگرمچھ صاحب خود داخل ہو جاتے ہیں۔ پادریوں نے اسے اپنی توہین خیال کیا اس زمانہ میں دہلی سے Morning post شائع ہوتا تھا۔ دوسرے دن اس میں نکلا کہ شب گذشتہ کالج میں ایک Mad molvi نے تقریر کی جو نامناسب تھی۔ کالج والوں نے تو کان پکڑے کہ آئندہ کسی باہر والے سے تقریر کرائی نہیں۔ چنانچہ برسوں اس پر کاربند رہے۔

آخری ملاقات کا حال سُنئے۔ مَیں والدِ مرحوم کے ساتھ رات کے وقت جا رہا ہوں۔ لال کنوئیں کی سڑک سے ہم گذر رہے ہیں۔ سخت جاڑے کا موسم ہے۔ سڑک خراب روشنی کم۔ یکایک ڈپٹی صاحب نمودار ہوئے۔ وہ بھی اُدھر ہی کو جا رہے ہیں جدھر ہم۔ سلام علیک ہوئی۔ مزاج پُرسی ہوئی۔ پھر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ تو یاد نہیں کہ گفتگو کس موضوع پر تھی۔ آخری فقرہ یاد ہے۔ تیلی کا تیل جلے اور مشعلچی کو صدمہ ہو۔ آخری حصّہ فحش تھا وہ بدل دیا گیا۔ آگے چل کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے۔ ہم گھر چلے آئے۔ پھر کبھی دیدار نصیب نہیں ہوا۔

ہائے کیا کیا صورتیں تھیں جو کہ پنہاں ہو گئیں

شبلی نعمانی

(۶)

ان کا نام سنا۔ انہوں نے کتابیں لکھیں۔ ہم نے پڑھیں۔ علم وفضل کے قائل ہوئے۔ ذہانت کے مقر۔ بزرگوں میں سے کوئی ان کا مدح خواں نہیں۔ سب کے سب نفور۔ پہلے یہ سمجھے۔ وجہ کچھ نہیں۔ جسے چاہا بھلا سمجھ لیا۔ جسے چاہا برا۔ ملنے کے بعد وجہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے دیکھی ہوگی۔ بری لگی ہوگی۔ ہم نے بھی دیکھی۔ ہرادا سے نخوت ٹپکتی تھی۔ ہم ٹھہرے بچہ یہ بزرگ۔ ہمیں بری نہیں لگی۔ وہ ہم مرتبہ۔ اُن کو ناگوار گذری۔ اپنے علم پر بھی بڑا ناز تھا۔

ان سے روشناسی ہوتی تو کیونکر ہوتی۔ ہم دکن میں۔ وہ شمالی ہند میں۔ بعد المشرقین۔ اتفاق کا خدا بھلا کرے۔ ملاقات کی سبیل نکل آئی۔ والد بزرگوار کی پنشن ہوگئی۔ دہلی آن رہے۔ ہم سال دو سال میں حیدرآباد کا پھیرا مارنے لگے۔ یوں تو کون آتا جاتا۔ بس، چلے آئے قصہ ختم ہوا۔ تلاوت علی۔ اب تلاوت جنگ۔ ان کی محبت ہم کو لے جاتی رہی۔ اُن کو لاتی رہی۔ اب تک یہ عمل جاری ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ بس ان ہی کے دم تک حیدرآباد ہمارا اور ہم حیدرآباد کے۔ پھر اللہ اللہ اور خیر صلا۔ یہ ہمارے

ساتھ کے پڑھے ہوئے۔ ہمارے ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ جانا کسی مطلب سے نہیں کسی غرض سے نہیں۔ مقصود دیدار۔ زیادہ قیام نہیں۔ آٹھ دس دن رہے چل دیئے۔ یارِ شاطر باش نہ بارِ خاطر۔

حیدر آباد سے واپسی ہے۔ ہم احتیاط کے بندے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر پہنچ جانے والے۔ اب جو آئے ٹرین بنی ہوئی کھڑی ہے۔ وقت پر روانہ ہو جائے گی۔ ٹکٹ لے دوم درجہ میں سامان رکھوا دیا۔ Seat reserved کرانے کا دستور نہیں۔ ایک سیٹ پر بستر لگا قبضہ کر لیا۔ اور مسافر آئے۔ باقی دونوں سیٹیں اُنہوں نے گھیر لیں۔ اب جو آئیں گے Upper Birth پر جا سکتے ہیں۔ دو دو خالی پڑے ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے۔ بہت سے ساتھ رخصت کرنے کو آئے۔ کوئی ہمارا جان پہچان بھی تھا۔ ہم سے کہا شبلی ہیں۔

لکڑی ہاتھ میں۔ ایک ٹانگ اللہ میاں کی بنائی ہوئی۔ دوسری اُن کے بندوں کی۔ صنعت گری خوب۔ قدرے لنگ موجود۔ حیران پریشان گاڑی میں آکر کھڑے ہو گئے۔ پائے چوبین بے تمکیں Upper Birth تک پہنچنے میں ہارج۔ نیچے کوئی سیٹ خالی نہیں۔ اب ہو تو کیا ہو۔ رات کا وقت ہے۔ دن ہوتا تو گذار بھی دیتے۔ اور جو دو صاحب تھے وہ خبر بھی نہ ہوئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کی شخصیت اور عذر سے واقف تھے۔

یا نہیں۔ مَیں نے اپنی سیٹ اُن کو پیش کی۔ اور خود اوپر چلا گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ درخواست قبول ہو گئی، مگر شکریہ کے لئے زبانِ مبارک متحرک نہیں ہوئی۔ نہ اور کسی ساتھی نے شکریہ ادا کیا۔ حق بہ حقدار رسید۔ شکریہ کیسا۔ ہاں آثار خوشنودی روئے مبارک سے ظاہر تھے۔ گویا میری سعادت مندی پسندیدہ ہے۔ پھر بات چیت ہوئی۔ والد سے ناواقف تھے۔ میرے چچا نواب ننھے خاں صاحب کو خوب جانتے تھے۔ رات کو ٹانگ اتار کر سو رہے۔ پھر سارے دن نہیں لگائی۔ منماڑ پر اُترنے کے وقت لگائی۔ یہ سفر کوئی چوبیس گھنٹے کا تھا۔ ہم براہِ اورنگ آباد جا رہے ہیں۔ صبح ہوئی تو بات چیت کا موقع آیا۔ پائے چوبین بھی معرضِ گفتگو میں آیا۔ مَیں نے ذکر نہیں چھیڑا کسی اور نے چھیڑا۔ فرمانے لگے۔ مَیں نے اپنے سامنے بیٹھ کر مستری سے بنوایا ہے۔ بڑی کاریگری کا بنا ہوا ہے۔ بالکل صحیح بنا ہوا ہے۔ یہ بھی فرمایا۔ اب تک کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تلوا کھُجلا رہا ہے۔ تلوا کہاں جو کھُجلائے۔ دماغی کیفیات ہیں۔

سارے دن ایک پیالی میں موٹے دانہ کا قند پاس رکھا رہا۔ بار بار چٹکی بھر لیا اور مُنہ میں ڈال لیں۔ جب تھوڑا رہ جاتا۔ نوکر آتا پھر پیالی بھر دیتا۔ میری تو ہمت نہیں پڑی کہ دریافت کروں۔ کسی اور نے پوچھا۔ فرمایا۔ اس سے کلام میں شیرینی پیدا ہوتی ہے۔ ہوتی ہو گی۔ اُن کے کلام میں تو شیرینی نہ تھی۔

گونہ کر خستگی تھی۔ نماز کی بابت ذکر آیا۔ شاید ظہرین کو جمع کرنے کا سوال تھا۔ فرمایا نماز جمع نہیں ہو سکتی۔ وقت پر ادا کرنی چاہیئے۔ پھر کلام پاک کی آیت پڑھی۔

اب ایک بات اور سُنیئے۔ میں اس زمانہ میں صبح کا کھانا نو بجے کھانے کا عادی تھا۔ تلاوت علی نے ٹفن باسکٹ لبالب بھر دیا تھا۔ اب تک انکی والدہ زندہ تھیں۔ یہ مرحومہ محترمہ کا حُسنِ سلوک تھا۔ اب وہ بات کہاں۔ بھلا اتنا دو دن میں کون کھا سکتا ہے۔ دستر خوان بچھایا۔ ان کی صلا کی۔ وقت نہ تھا۔ انکار کر دیا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جب وہ کھانے بیٹھے تو ہماری بات بھی نہ پوچھی۔ خوردی اور بزرگی کا خیال درمیان تھا۔ اگر یہ زمانہ ہوتا تو پھر میں بھی اِن کی بات نہ پوچھتا۔ یہ دوسرا واقعہ ہے کہ حواریانِ سر سید حسن تواضع سے انحراف کرتے ہیں۔ میں نے اِن سب کی یہ عام خصلت پائی ہے۔ ممکن ہے انگریزی طرز اختیار کرنے کا یہ اثر ہو۔ خاندانی لوگ تھے۔ بھوکے ننگے نہیں۔ چُوڑے چمار نہیں۔ قدیم تعلیم اور جدید خیالات دونوں کے حامل۔ بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ پھر یہ کیا تھا۔ عقل کام نہیں کرتی۔

اب اِن کا حلیہ سُنیئے اور لباس پر نظر ڈالیے۔ یہ سید احمد خانی وردی میں نہ تھے۔ صرف وردی کی ٹوپی سر پر تھی اتنا زمانہ گذر گیا کہ اِس وردی کے

دیکھنے والے بھی نہیں رہے۔ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ نوشتہ بماند سیاہ بر سفید۔

سر پر ترکی ٹوپی برنگِ عنابی۔ پھندنے دار۔ گلے میں ٹرکش کوٹ۔ یعنی فروک۔ کالر ٹرن نہیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی نہیں۔ نیچے وسٹ کوٹ۔ اُس کا بھی گلا بند۔ اندر سے شرٹ کا سفید کالر جھانک رہا ہے۔ پادریانہ فیشن۔ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے۔ نیچے پتلون تھیلا سی۔ شیپ نہیں۔ کریز نہیں۔ پاؤں میں منڈا یعنی شوز۔ لباس آنکھوں کو بھلا نہیں لگتا۔ سارے حواری یہ وردی نہیں پہنتے۔ ٹوپی سب پہنتے ہیں۔ فُل ڈریس میں صرف یہ تین آدمی ہم نے ہمیشہ دیکھے۔ مزمل اللہ خاں۔ سمیع اللہ خاں۔ مصطفےٰ خاں رجوان مر گئے۔ علی گڑھ کے آس پاس کے رئیس تھے) خود سر سید احمد خاں۔ منشی ذکاء اللہ کبھی اِس رنگ میں نہیں رنگے گئے۔ ترکی ٹوپی تک انہوں نے نہیں پہنی۔ حالی صاحب۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ شبلی نے ٹوپی پہنی۔ لباس نہیں پہنا۔

یہ تو برسبیلِ تذکرہ تھا۔ اب شبلی صاحب کا حلیہ سُنئے۔ میانہ قامت گندمی رنگ۔ نہ دُبلے نہ موٹے۔ کشادہ پیشانی۔ چہرہ پر دلالت نہیں۔ آنکھوں میں ذہانت۔ قیافہ حافظہ کی قوت کا پتا دیتا ہے۔ ترکی ٹوپی۔ حیدرآبادی اچکن۔ پتلون نما پاجامہ۔ انگریزی جوتی۔

یہ صحبت رات کے کوئی نو بجے سے شروع ہوئی۔ دوسرے دن سہ پہر کو ختم ہو گئی۔ پھر ہم کہاں اور وہ کہاں۔ یاد باقی رہ گئی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

نواب مرزا داغ دہلوی

(۷)

ہماری عُمر کوئی گیارہ بارہ برس کی ہوگی۔ داغ صاحب حیدرآباد آئے۔ اعلیٰحضرت کے استاد مقرر ہوئے۔ بیش قرار تنخواہ قرار پائی۔ کیوں نہ ہو بادشاہ کے استاد ہیں کسی ہمہ شما کے تھوڑی۔ یہ بدعت ابوظفر بہادر شاہ کی ایجاد ہے۔ وجہ ہونی چاہیئے۔ بادشاہ اب نام کے بادشاہ لال حویلی کی چار دیواری کے اندر حکومت۔ باہر سرکار کمپنی کا راج۔ ایک لاکھ روپیہ ماہوار پنشن۔ اس کو چاہو اوڑھو چاہو بچھاؤ۔ سارا ٹبّر پالو۔ نہ کوئی کام نہ کوئی کاج۔ خالی سے بیگار بھلی۔ بیکاری کا مشغلہ شاعری۔ اِس میں کچھ واہ ہوا واہ ہو ہی جائے گی۔ میدانِ جنگ کی واہ ہوا واہ تو دوسروں کی میراث ہوگئی۔ سارے شاہزادوں اور سلاطین کا یہی مشغلہ قرار پایا۔ شاعری تو کیا خاک ہوتی تُک بندی ہونے لگی۔ طرفہ یہ کہ غزلیں بکتیں۔ ان کے تخلّص ڈال دیئے جاتے۔ تُک بندوں کے پیٹ پلتے۔ مشاعرے ہوتے۔ صاحب عالم تحسین و آفرین کی صدائیں سنتے۔ جانور فربہ شود از راہِ نوش۔ آدمی فربہ شود از راہِ گوش۔ یہ وبا سارے ملک میں عام ہوگئی۔ اب تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہی داغ صاحب

کی پرورش کا باعث ہوئی۔ بھلا رئیسوں کو شعر گوئی سے کیا مطلب۔ اگر کہیں بھی تو وہ کس مصرف کا۔ شاعری کے لئے اچھی تعلیم درکار۔ یہاں اس کا کال۔ یہ دو سطریں لکھیں تو وہ بھی بدِ املا۔ بد قوارا۔ کہ سے تم لکھتے تو ہم نے دیکھا ہے۔ کوئی پوچھے کسی بادشاہ کی شاعری کو فروغ ہوا۔ آج ان کا کوئی نام بھی لیتا ہے۔ جو آپ کی شاعری کو فروغ ہوگا۔ بیشک مصاحب پیٹ کی خاطر واہ واہ کریں گے اور پیٹھ پیچھے ہنسی اُڑائیں گے۔ غلط سلط اچھا بُرا سب اچھا۔ یہاں اچھے بُرے سے بحث ہی کیا۔ پیٹ کا سوال ہے بینگن کے نوکر تھوڑی ہیں۔ حضور کے نوکر ہیں۔ مگر حضور پیٹ بھر کے ہیں۔

ایک ذکر سماعی ہے۔ لکھے بغیر طبیعت نہیں مانتی۔ اگر دروغ ہے تو برگردنِ راوی۔ رئیس صاحب تشریف فرما ہیں۔ صحیفۂ اشعار رحل پر سامنے ہے۔ گویا مصحفِ شریف ہے۔ دائیں بائیں دو قطاریں مصاحبوں کی کھڑی ہیں۔ داد کا انداز نرالا ہے۔ اِدھر کے آدمی اُدھر اور اُدھر کے اِدھر آداب بجا لاتے آئیں اور جائیں۔ ماشاء اللہ کیا جدت ہے۔ کرسی پہ وزیر اعظم تشریف فرما ہیں۔ سرکار انگریزی سے سر کا خطاب پایا ہے بڑی بڑی ملازمتیں کر چکے ہیں۔ بڑے موقر ہیں۔ بہت قابل ہیں پیٹ کی خاطر دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شعر خوانی ہو رہی ہے۔ آرک جارک

جاری ہے۔ یہ چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ کہاں تک گلا پھاڑتے۔ نوبت بہ مقطع رسید۔ جو داد نہیں دیتے تو خاطر عاطر پر گراں گذرتا ہے۔ آدمی ٹھہرے ہوشیار۔ جہاں دیدہ۔ سرد و گرم روزگار چشیدہ۔ یکایک چونک پڑے۔ عرض کی یہ حضور کی غزل ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا دیوانِ حافظ پڑھا جا رہا ہے۔ ساری بُرائی دُھل گئی حضور فیض گنجور پھولے نہ سمائے۔ لو ہمارا کلام حافظ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اِن قصّوں کو جانے دیجئے۔ خدا معلوم سچّے ہیں یا من گھڑت۔ اب داغ صاحب کا حال سُنئے۔ اگر سب لکھوں تو دفتر سیاہ کروں پڑھنے والے اُکتا جائیں۔ اختصار مناسب حال۔

ہمارے گھر میں مشاعرہ ہے۔ ہمارے باوا نے نہیں کیا۔ حبیب کنتوری نے کیا ہے۔ یہ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اِن کا گھر چھوٹا۔ ہمارا بڑا۔ گھر مانگے کو لے لیا ہے۔ بڑے بڑے دالان۔ اتنے بڑے کہ ہاتھی سما جائے۔ سامنے صحن۔ چبوترہ۔ وہ بھی اِسی انداز کا۔ زمین سے پانچ چھ فٹ بلند۔ بیچ میں حوض مگر قطرہ پانی کو ترسے۔ کسی امیر کا دیوانخانہ ہے۔ ہم تو کرایہ دار ہیں۔ مشاعرہ کے لئے موزوں۔ بہت آدمی آ سکتے ہیں۔

داغ صاحب کو حیدر آباد آئے ہوئے خاصہ عرصہ گذر گیا ہے۔ اِس عرصہ میں بہت سے مشاعرے ہوئے یہ پہلا مشاعرہ ہے جس میں انہوں نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ بہ دیر تشریف لائے۔ اندر کے دالان میں صدر مقام پر بٹھائے گئے۔

حلیہ سُنئے۔ دراز قامت۔ فربہ اندام۔ رنگ گندمی مائل بہ سیاہی نقشہ بھدّا۔ آنکھوں میں رس۔ آواز ایسی پاٹ دار کہ سارا مکان پڑا گونج رہا ہے۔ دور پاس کوئی محروم نہیں۔ پھر اس میں ترنّم۔ مگر سائل صاحب جیسا نہیں۔ نہ آج کل کے شاعروں کا ساجو پورے گویّے ہیں۔ شعور دور۔ گانا اچھا۔ اکثر بے معنی۔ الفاظ کا ڈھیر ہے تو کون کہے۔ گالیاں کون کھائے مُنہ پھٹ۔ ہجو ان کے بائیں ہاتھ کا داؤں۔ اپنی کون مٹّی پلید کرائے۔ دعا کیجئے۔ خدا ان کو عقلِ سلیم عطا کرے۔ کٹ کھنوں کی شاعری میں اوقات ضائع نہ کریں۔ داغ صاحب کا لباس دہلی کے نواب زادوں کا لباس سر پر چوگوشیہ ٹوپی لیس ٹکی ہوئی۔ بدن میں جامدانی کا انگرکھا۔ اس تن و توش پر زیب نہیں دیتا۔ آگے چل کر حیدر آبادی اچکن میں نظر آئیں گے۔ مصرعِ طرح یاد نہیں اپنا شعر یاد ہے۔ ایک ہی کہا تھا۔ دوسرا نہیں ہوا۔ وہ حاضر ہے ؎

وہ کونسی ہے آفت جو یاں نہیں ہے آئی + اِک تو ہی رہ گئی تھی اے مرگِ ناگہانی

ناگہانی۔ زبانی قافیہ۔ ردیف ندارد۔ یاد نہیں کہ طرح میں داغ نے غزل پڑھی یا نہیں۔ ہاں غیر طرح غزل لاجواب تھی۔ سارا مشاعرہ ہر شعر پر گونج اٹھتا۔ ایک شعر عرض ہے ؎

چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے ✤ مرے آشیانہ کے تھے چار تنکے

والد صاحب قبلہ اکثر داغ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے مشق سخن کرتے تھے۔ بیدل تخلص فرماتے۔ داغ سے تلمذ نہیں۔ پہلے مرزا قربان بیگ سالک سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے بعد حالی سے۔ کبھی کبھی میں ہم رکاب ہوتا۔ ایک دن چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اور چاندنی بھی دکن کی۔ ہر برگِ سبز چاندی کا پترہ بن رہا ہے۔ داغ صاحب دال منڈی میں رہتے ہیں۔ مکان منڈی کے دروازہ سے ملحق ہے۔ پشت پر سڑک شیدی عنبر کے بازار کو جا رہی ہے۔ سڑک کے اُس پار افضل گنج کی مسجد۔ بالاخانہ پر نشست ہے۔ صحن میں تخت بچھے ہوئے ہیں۔ اُن پر چاندنی کا فرش۔ خاصدان اور کلی آگے رکھے۔ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم حاضر ہوئے۔ رات خاصی آ گئی تھی۔ دو چار آدمی صحبت میں تھے۔ والد سے بہت تپاک سے ملتے تھے۔ بڑی دیر صحبت رہی۔ کئی غزلیں سنائیں۔ تکبر نہیں۔ شاعرانہ تبختر نہیں۔ کہو گے تو ضرور اور بے کہے بھی کلام سنا دیں گے۔ جانتے ہیں۔ جو آتا ہے اسی غرض سے آتا ہے۔

پھر اس کو تشنہ کام کیوں بھیجا جائے۔ خود نمائی اور خود ستائی مدعا نہیں۔ اس وقت کی گفتگو کا ایک حصہ یاد ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ فرمانے لگے میری رات گئے تک یہاں نشست رہتی ہے۔ سامنے سڑک ہے آدمی آتے جاتے ہیں۔ رنگین مزاج بھی ہوتے ہیں (آگے دال منڈی کا تھیٹر ہے۔ شاید یہ آمد و رفت اس وجہ سے ہو) گاتے ہوئے بھی گذرتے ہیں۔ اکثر میرے شعر ہوتے ہیں۔ تعریف کا یہ انداز حرام زادہ نے کیا ہی خوب کہا۔

یہ کہکر شعر کے مزے لیتے ہیں۔ میں تو عاجز آ گیا ہوں۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

اِس نہیں کا کہیں علاج نہیں + روز کہتے ہیں وہ کہ آج نہیں

دیکھئے میرے شعروں کی یوں داد ملتی ہے۔ والد ماجد کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ پانی مرنا تھا۔ داغ صاحب کے چہرہ سے ملال کے آثار نہیں مسرت کے آثار نمایاں تھے۔

دُوسرا واقعہ سُنئے:۔

نواب احمد حسن خاں باپ دادا کی میراث اُڑا ہاتھ جھاڑ ہو بیٹھے۔ کبوتر بازی کے ماہر۔ اِس کو ذریعہ معاش بنانا چاہا۔ جنگلیوں کا ساتھ تیار کیا۔ اِس کو ساتھ لے حیدر آباد روانہ ہوئے۔ شاید خان خاناں بہادر

گے ایما سے ہو۔ سُنا ہے اِن کو کبوتر بازی سے شوق تھا۔ یہ بھی دہلی کے نوّاب زادے۔ داغ بھی دہلی کے نوّاب زادے۔ قدیم مراسم۔ اِنکے ہاں جا اُترے۔ دیوان خانہ کی چھت پر چھتری نصب ہوئی۔ سیڑھی لگا پھٹکیاں چڑھائیں۔ سامنے دال منڈی۔ یہاں ناج کے ڈھیر کے ڈھیر باہر پڑے ہیں۔ جنگلی کبوتروں کے جھلڑ کاوے کاٹ رہے ہیں۔ کبوتر کھولے۔ ٹڑیہاں دیں۔ پھر چھپی دکھادی۔ سب ایک دم اُڑ ناج پر جا پڑے اب لاکھ دانا اُچھالتے ہیں۔ آؤ آؤ کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں کبوتر آنے کا نام تک نہیں لیتے۔ ننگے سر ننگے پاؤں۔ وحشت زدہ صورت چھپکا رشبکہ ہاتھ میں منڈی کی طرف دوڑے۔ پھر بھی ایک ہاتھ نہ لگا۔ یہاں کے کبوتروں میں جا ملے۔ کند ہمجنس با ہمجنس پرواز۔

اِس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن ہم داغ صاحب سے ملے۔ اُنہوں نے اس سرگذشت کو ایسے دلفریب اور پر مذاق پیرایہ میں ادا کیا کہ باید وشاید۔ فقرہ فقرہ پر ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑے جاتے تھے۔ اب تک جب خیال آجاتا ہے ہنسی آجاتی ہے۔ سارا نقشہ آنکھوں تلے پھر جاتا ہے۔ میں نے جو لکھا ہے وہ گھانس کاٹی ہے کوشش بہت کی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اِن کی شاعری کا قائل تو ایک زمانہ ہے میں خوش بیانی کا بھی دل سے قائل ہوگیا۔

مولوی الطاف حسین حالی حیدر آباد آئے۔ ہمارے مہمان ہوئے
اِن کے ہمرکاب داغ صاحب کے ہاں جانے کا بار بار اتفاق ہوا۔ دونوں
بڑی محبت سے ملے۔ شاعرانہ رقابت کا پتا نہیں۔ ایک دوسرے کا
دل سے مدّاح۔ شاعری کا رنگ جُدا جُدا۔ اِن کا مولویانہ۔ اُن کا عاشقانہ
دونوں ایک دوسرے کو کلام سُنانے۔ دل کھول کر داد دیتے۔
فی الحقیقت کلام دونوں کے اپنی اپنی جگہ قابلِ داد ہیں۔
جب آخری مرتبہ حاضری ہوئی تو دو چار منٹ ہی صحبت رہی۔
اعلیحضرت کے پاس سے سوار آیا۔ غزل لایا۔ یہ لفافہ لے۔ معذرت
کر اندر چلے گئے۔ ہم گھر چلے آئے۔ آج بھی رات کا ہی وقت تھا۔ یہ
معلوم نہیں کتنی دیر میں غزل بنا کر واپس کی۔ سوار دروازہ پر کھڑا تھا
سُنا ہے بہت جلد واپس کر دیا کرتے تھے۔ اِس کے بعد والد کی پنشن
ہوگئی۔ ہم دہلی چلے آئے۔ پھر اُن کا انتقال ہوگیا۔ صورت دیکھنی نصیب
نہیں ہوئی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

(۸)

یہ حیدر آباد آئے ہوئے ہیں۔ اِن کی کتابیں ہم نے پڑھی ہیں۔ فسانۂ آزاد بھی دیکھا ہے۔ پُورا نہیں۔ اتنا صبر نہ تھا۔ ادھورا۔ سدھورا۔ یہ بھی خبر نہیں کہاں اُترے ہیں۔ ہم کم آمیز ملنے جُلنے کے چور۔ ہم کیا ہمارے باوا کی بھی کوئی حیثیت یا شخصیت نہیں۔ پھر یہ ہمارے گھر کیوں آنے لگے۔ اور ہم تو کسی کے ہاں جانے والے ہی نہیں۔ کسے باشد۔ پھر ملاقات کی کیا صورت ہو۔ عام جلسوں کا رواج نہیں کہ وہاں صورت نظر آجائے۔ خدا کارساز ہے۔ ملاقات ہوئی اور دل کھول کر ہوئی۔ اور مدت تک رہی۔ یہ ہماری بچپن کی عادت ہے۔ شام ہوئی اور ہوا خوری کو نکل کھڑے ہوئے۔ گھر میں دل ہی نہیں لگتا۔ جب تک حیدر آباد میں رہے روز باغِ عام کا پھیرا۔ کبھی گھر کوئی کبھی کوئی۔ کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ ذاتی مکان نہیں۔ جہاں مناسب معلوم ہوا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اتفاق یہ کہ ہمیشہ قیام باغِ عام کے قرب وجوار میں رہا۔ پھر وہاں جانا کیا دشوار۔ جاتے ہیں خاصی ہوا خوری ہو جاتی ہے سبزہ و گُل دیکھ لیتے ہیں۔ سبزہ زار بھی ہے لبِ آب بھی۔ سرِ چمن بھی ہے اور

سروِ رواں بھی ۔ گُلِ گُلزار بھی ہے اور گُلِ تر بھی۔ مے و مطرب سے
کبھی شوق نہ تھا۔ یہاں دل بستگی نہ ہو تو کہاں ہو۔ یہ سب عُمر کا تقاضا
ہے ۔ دنیا میں فرشتہ پیدا نہیں ہوتے ۔ نہ ہمیں فرشتہ سیرت
ہونے کا دعوےٰ ۔ ہمارے یار دوست سبزہ و گُل کے پیاسے ۔
لبِ آب کے شائق روز جمع ہو جاتے ہیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ صحبت گرم
رہتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ نہیں کہ کھیل کود کا مدارس میں انتظام ہو۔ یہ تو صرف
تعلیم گاہیں ہیں۔ یہاں آؤ پڑھ لو۔ کھیلو جہاں چاہو۔ بچّوں کی صحت سے کیا
واسطہ۔ یہ تو ماں باپ کا فرض ہے جس طرح چاہیں صحت کا خیال کریں۔
بُرے اصول تھے ۔ خدا کا شکر ہے ختم ہو گئے ۔

پنڈت رتن ناتھ بھی گُل و گلشن کے شیدائی ۔ روزانہ یہاں
آجائیں۔ اور تنہا آئیں۔ خدا معلوم کہاں اور کس کے ہاں رہتے ہیں۔ ہمنے
کبھی دریافت نہیں کیا۔ ہماری یہاں ایک خاص بنچ ہے ۔ اُسی پر جا کر
بیٹھتے ہیں۔ کیا معلوم ان کو ہماری کون سی آن پسند آئی ۔ ہماری صحبت
میں بیٹھنے لگے ۔ عُمر کا تفاوت۔ اس کا مقتضیٰ نہ تھا۔ تاہم ہم میں آن ملے ۔
چاہو یہ کہو کہ سینگھ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے ۔ اِن کی صحبت کبھی ناگوار
نہیں ہوئی ۔ بزرگانہ آداب میں فرق نہیں آیا اور رنگِ صحبت بھی
خراب نہ ہوا۔ یہ ہمارے اور اِن کے حسنِ اخلاق کی دلیل ہے۔ جہانتک

یاد ہے کسی نے تعارف نہیں کرایا۔ گمان یہ ہے کہ اُنہوں نے خود ہی فرمایا ہو کہ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار ہوں۔ ہم تو یہ کبھی نہ پوچھتے۔ جو خوشی سے ملا بات چیت کر لی۔ نام و نشان سے کیا غرض۔ اگر اُس وقت ان کے حالات لکھنے کا خیال ہوتا تو ساری ان کی باتیں گرہ میں باندھ لیتے۔ اب کفِ افسوس ملتے ہیں۔ پھر پچھتائے کیا بنے جب چِڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اسی زمانہ میں ان کا ناول کُڑم دُھم شائع ہوا تھا اُنہوں نے خود لا کر ایک نسخہ ہم کو دیا۔ اس پر اُن کے دستخط نہ تھے۔ ان کے ہاتھ کی تحریر ہم نے نہیں دیکھی۔ یہ کتاب بھی نہ رہی کوئی لے گیا۔

صرف ایک واقعہ یاد ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

باغِ عام میں دو بڑے بڑے تالاب ہیں۔ جب ہم اپنے مقام پر جاتے ہیں ایک تالاب پر سے گذر ہوتا ہے۔ موسم بہار ہے شام کے وقت حسب معمول ہم جا رہے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لبِ آب ایک گھانس کے تختہ پر غاشیوں کا فرش ہے۔ اور جلسہ کا سا اہتمام ہو رہا ہے۔ ہم اپنی جگہ پر چلے گئے۔ وہاں سے یہ تختہ نظر تو آتا ہے۔ آدمی چلتے پھرتے معلوم تو ہوتے ہیں۔ مگر پہچانتے نہیں جاتے۔ کچھ دیر بعد پنڈت جی اُدھر سے ہماری طرف آتے نظر آئے۔ آج ذرا تشریف لانے میں دیر ہو گئی ہے۔ فرمانے لگے میں اس جلسہ میں شریک تھا

جانتے ہو یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کی خبر نہیں۔ سنو گے تو تعجب کرو گے۔ تم نے دو بڈّھے یہاں اکثر چلتے پھرتے دیکھے ہوں گے۔ اِن کی شکل و شبہات بیان کی۔ ہم سمجھ گئے۔ یہ تقریب انہوں نے کی ہے ان کے دو بچّے کوئی گیارہ گیارہ برس کی عمر کے ہیں۔ اِن کو آج پہلے دن شراب پلائی گئی ہے۔ اُس کی یہ رسم ادا ہوئی ہے۔ یہ سُن کر حیرت ہوئی۔ اول تو یوں ہی کسی مذہب و ملّت میں شراب کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پھر یہ دونوں صاحب مسلمان ہیں۔ سفید ریش ہیں۔ معمّر ہیں۔ صاحب صورت بھی معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس مسلمانان در گور اور مسلمانی در کتاب۔ پنڈت جی اِس رسم سے خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ گونہ افسوس اُن کے چہرہ سے نمایاں تھا۔ سنا ہے کہ پنڈت جی بت پرست نہیں۔ مے پرست تھے۔ مگر ہم نے سرشار کو اتنے عرصہ میں سرخوش بھی نہیں دیکھا۔ آج اِس جلسہ میں اِنہوں نے شرکت تو کی تھی۔ مگر شغل نہیں کیا تھا۔ کسی قسم کی بدبو اِن کے مُنہ سے نہیں آتی تھی خاکسار برابر میں دیر تک بیٹھا رہا۔

پنڈت جی شکل صورت سے بالکل مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ اچھی بڑی ڈاڑھی ہے۔ موچھیں بھی ترشی ہوئی ہیں۔ بلند قامت ہیں۔ چھریرا بدن۔ بہت دبلے نہیں۔ رنگ خاصہ گورا ہے ترکی ٹوپی پہنتے

ہیں۔ جو خاص مسلمانی پہناوا ہے۔ تقریر نہایت شُستہ۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ساری عمر لکھنؤ میں رہے ہیں۔ بالکل دہلی کی بامحاورہ اُردو بولتے ہیں۔ ہر صحبت کو ختم ہوتا ہے۔ یہ صحبت بھی چند ماہ میں ختم ہوگئی۔ اُنہوں نے باغ میں آنا چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ ہم نے بھی پُرس و جُو نہیں کی۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کیوں ربط ضبط نہ بڑھایا۔ جوانی اور بچپن کے دن ایسے ہی ہوتے ہیں۔ رنت نئے مشغلے پیش آتے ہیں۔ نئی صحبتوں میں شرکت ہوتی ہے۔ سب کچھ گذرا چلا جاتا ہے۔ ہر عمر کی دل بستگی جداگانہ ہوتی ہے۔ ہم بھی اس کُلیّہ سے مُستثنیٰ نہیں۔

مولوی خواجہ الطاف حسین حالی

(۹)

اِن سے خاندانی تعلقات دیرینہ ہیں۔ ہمارا وجود بھی نہ تھا۔ نواب کرم اللہ خان (عرف ننھے خان) شیداؔ۔ اور مولوی عبدالرحیم خاں بیدلؔ۔ میرے چچا اور باوا۔ رات دن کے ہم نشین مرتے دم تک کے ساتھی۔ میں ان کا بچّہ۔ ہوش سنبھالا تو حالؔی کو دیکھا۔ دیکھا ہی نہیں۔ گودوں میں پلا۔ پھر دکن چلا جانا ہوا۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔ حالؔی خود لاہور چلے گئے۔ یہ دو شعر گواہ ہیں:۔

بختِ ہم داستانیٔ شیدا ٭ تونے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ گاہیٔ رشکی تونے بھی ہم سے بیوفائی کی

شیدا نواب کرم اللہ خاں۔ رشکی نواب محمد علی خاں رئیس جہانگیر آباد۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ حالؔی کو ترکِ وطن سے زیادہ ترکِ دہلی ناگوارِ خاطر تھا ؎

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جلنے سے دل سیر ٭ گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

حالؔی صاحب سرسیّد کے وفد کے ممبر بن کر حیدر آباد تشریف لائے

میری عمر اس وقت بارہ تیرہ برس کی تھی۔ وفد بشیر باغ میں اُتارا گیا۔ سب ریاست کے مہمان ہیں۔ حالؔی صاحب کی وجہ سے روز کا آنا جانا ہے۔ باغ کے خانگی تھیٹر میں لکچر ہوئے۔ ہم بھی موجود تھے۔ حالؔی صاحب اِس میدان کے مرد نہ تھے۔ ہاں موجود رہتے تھے۔ کلام بھی نہیں پڑھتے تھے۔ اس موقع کے لئے کچھ کہتے تو پڑھنے۔ کوئی مشاعرہ تھوڑی تھا جو چاہا پڑھ دیا۔ غرض وفد وداع ہوا۔ سرکاری مہمانداری ختم۔ حالؔی کا ابھی قیام کا خیال ہے۔ ہمارے غریب خانہ پر آ گئے۔ والد مرحوم حیدرآباد کے اُمراء اور اعلیٰ عہدیداروں کے مقابلہ میں ہیچ۔ رہنے کو نہ محل نہ کوٹھی۔ معمولی کرایہ کا مکان۔ مگر وسیع۔ شہر سے خاصے فاصلہ پر۔ سواری کو ایک گھوڑے کی گاڑی۔ صاف ستھری۔ رنگ روغن سے آراستہ۔ جوڑی یا چوکڑی ہمارے پاس کہاں دھری۔ اُمراء کا اصرار ہوا۔ عہدہ داروں کا تقاضا۔ مگر اِس اللہ کے بندے نے اسی کو ترجیح دی۔ سب سے انکار کر دیا۔ سید حسین بلگرامی بار بار تشریف لائے۔ اپنے ہاں لیجانے پر مصر ہوئے۔ مگر وہی ایک نہیں۔ فرمایا جس خاندان کا ہمیشہ مہمان رہا ہوں اُسی کا رہوں گا۔ اللہ رے وضعداری۔ یہ صحبت مہینہ سوا مہینہ تک رہی۔ پھر وطن کو سدھارے۔ بقول اِن کے کہنا پڑا استاد کا سنجوگ ہے یاں کا سنجوگ۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ حالی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ والد مرحوم سے خط وکتابت جاری ہے۔ غزلیں جاتی ہیں۔ اصلاح ہو کر آجاتی ہیں۔ اپنے تازہ کلام سے بھی یاد فرماتے رہتے ہیں۔ مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ دوسروں کو سُناتے ہیں۔ بچپن کا حافظہ حفظ بھی ہو جاتا ہے۔ سارا ذخیرہ موجود تھا۔ حالی صاحب کے صاحبزادے نے لے لیا پھر واپس نہ کیا۔ تقاضا شیوۂ ادب کے خلاف تھا۔ ایک دو بار ملاقات کے دوران میں واپس کرنے کا خیال بھی ظاہر فرمایا مگر بے سود واپس نہیں کیا۔ خیر کیا مضائقہ اُن کے والد کا مال تھا خدا اُن کو مبارک کرے۔ یہاں اِس کی تمنّا بھی نہیں۔ ایک خط دست بردِ زمانہ سے بچ رہا وہ بھی یُوں کہ ایک کتاب میں رکھا پڑا رہ گیا۔ اتفاقاً ورق گردانی میں برآمد ہو گیا۔ خدا کی شان جس چیز کی حفاظت کی جائے وہ تو نہ رہے اور جو یُوں ہی ڈال دی جائے وہ رہ جائے۔ انشاء اللہ آخر میں نقل درج کروں گا۔

ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ یہ صرف دو شاعروں میں پائی ہے۔ ایک حالی اور دوسرے داغ۔ دونوں نخرہائے نہ تھے۔ باقی جتنے دیکھے نہ کچھ تھے نہ بات مگر نخروں میں طاق۔ حالی کے پاس کوئی آیا۔ اُس کی رغبت کلام کی طرف پائی۔ چٹ بیاض کھول بیٹھے اور سُنانا شروع کر دیا

دوسروں کا کلام بھی بہت خوش ہو کر سُنتے اور پیٹ بھر کے داد دیتے۔

ایک واقعہ سُنئے۔ اگرچہ بہت بعد کا ہے یٰسین بابو جواب دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں۔ یہ میرے مشن کالج کے ساتھی پروفیسر ہیں۔ حالیؔ صاحب دہلی آئے ہوئے تھے اور ہمارے مہمان۔ اِن سے بھی تذکرہ آیا۔ انہوں نے ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ میں ساتھ لے چلا آیا۔ تعارف اِس عنوان سے کیا کہ صاحبِ موصوف فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ اور اپنے فن میں یکتائے روزگار۔ انہوں نے عرض کیا کہ وہ اپنی قلم سے کچھ لکھ دیں اور وہ بطریقِ یادگار حرزِ جان بنا کر رکھیں۔ بلا تکلّف ایک کاغذ کا پُرزہ لے اُس پر یہ رباعی لکھ حوالے کی۔ جو اِن کے حسبِ حال تھی۔

رُباعی

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا ✤ آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے ✤ انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

مجھ سے زیادہ میری بیوی سے اُن کو تعلق تھا۔ وہ نوّاب ننھے خاں کی متبنّیٰ صاحبزادی۔ ہم تو حیدرآباد بھی چلے گئے مگر ان کا تو یہیں کا رہنا سہنا۔ اور حالیؔ کا روز کا آنا جانا۔ جتنا تعلق ہوتا کم تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ہمارے خاندان میں پردہ کی وہ شدّت کہ الامان۔ زنان خانہ میں

پرندہ پر نہ مار نا تھا۔ مگر میری بیوی کا اُن سے پردہ نہ تھا۔ میری شادی کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حالی صاحب تشریف لائے ہوں اور آتے جاتے گھر میں آکر اُن سے بغیر ملے چلے گئے ہوں۔ آخری مرتبہ جب دہلی تشریف لائے اور اُن سے رخصت ہونے گھر میں آئے تو میں بھی موجود تھا۔ صحت میں کوئی خاص خرابی نہ تھی۔ ضعفِ پیری ضرور تھا۔ رخصت ہوتے وقت فرمانے لگے۔ بیٹی خدا حافظ اب ملنا نہیں ہوگا۔ وہ رونے لگی۔ آپ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ واقعی اس کے بعد وہ اُن سے نہ مل سکی۔ وہ دہلی آئے مگر مفلوج۔ ایک کوٹھی میں اُترے میں بار بار گیا۔ پردہ کی وجہ سے وہ نہ جا سکی۔ اس زمانہ میں گویائی بالکل مفقود تو نہیں ہو گئی تھی مشکل سے ایک دو لفظ بول سکتے تھے پہلی مرتبہ جب سول سرجن معائنہ کو آیا۔ میں بھی وہاں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور میز سامنے تھی۔ میز پر سے قلم اٹھا کر سول سرجن نے اُنکے سامنے کی اور پوچھا یہ کیا ہے۔ یہ دماغی امتحان کے طور پر تھا۔ ان کی عادت تھی جب اُن سے سوال کیا جاتا تو سلسلۂ کلام خیر کے لفظ سے شروع کرتے اور یہ ایک خاص انداز میں ہوتا۔ اس کے ساتھ تبسّم کی کیفیت چہرہ پر نمایاں ہوتی۔ چنانچہ اس وقت بھی خیر کا لفظ حسبِ عادت کہا اور مسکرائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سول سرجن کے سوال پر

ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایسا بیہوش نہیں ہوں ۔ پھر قلم کا لفظ بولے ۔

اس کے بعد وہ پانی پت چلے گئے ۔ میرے یہ خدمت سپرد ہوئی کہ وہاں سے جو کیفیتِ مرض کا خط آئے وہ میں سول سرجن کو جا کر سُنا دیا کروں اور وہ جو مشورہ دے وہ لکھ بھیجا کروں ۔ چند ماہ یہ خدمت انجام دینی نصیب ہوئی ۔ پھر انتقال فرمایا ۔ جس دن میں ان کا یہ حال دیکھ کر آیا تھا ۔ دل پر ایک صدمہ تھا ۔ اسی حالت میں یہ چند شعر کہے ۔ جو عرض کرتا ہوں ۔

یہ احوال حالیؔ کا خواجہ سے کہدو ✣ ہے زندہ مگر اُس کو چپ لگ گئی ہے
یہ حالیؔ نہیں اُس کا بت ہو تو ہو یہ ✣ مگر کس بلا کی یہ کاریگری ہے
سکوتِ مجسّم تعجب کی جا ہے ✣ خموشی تو ضرب المثل موت کی ہے
سزائیں بہت ملتی دیکھی ہیں ہم نے ✣ مگر یہ سزا تو نرالی ملی ہے
جو بکوا سیا ہو اُسے چُپ لگا دو ✣ زباں تم نے بلبل کی کیوں چھین لی ہے
ہر اِک بات سے پھول جھڑتے ہیں اِسکی ✣ یہ ہیں شعر یا پھولواڑی لگی ہے

اِس زمانہ کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو ۔ آخری مرتبہ حالتِ صحت میں جب حالیؔ صاحب دہلی تشریف لائے تو میرے لڑکے خواجہ محمد شفیع

کی عمر کوئی پانچ برس کی تھی۔ اُن کے دو لاڈلوں کا لاڈلا۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی میرے واسطے کوئی شعر کہہ دیجئے۔ وعدہ کر لیا۔ جب جانے لگے تو اُس سے کہنے گئے۔ بیٹا میں نے بہت کوشش کی مگر اب دماغ میں شعر کہنے کی جان باقی نہیں۔

ایک اور واقعہ سُنیئے۔ میں حالیؔ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ سامنے سے شفیع کھیلتا ہوا گزرا۔ میں نے "تو" کہکر بلایا۔ بولے تُو کہکر نہ پکارو۔ بچّوں سے اِس طرح نہیں بولنا چاہیئے۔ ان میں خودداری کم ہو جاتی ہے۔

میرے والد کا انتقال ہوا تو حالیؔ صاحب زندہ تھے۔ مگر نیم مُردہ۔ اطلاع پر تعزیت نامہ کسی اور سے لکھوا کر بھیجا۔ اپنے ہاتھ سے معذرت میں صرف ایک سطر لکھدی۔

اسی مرتبہ ایک دن دیوان خانہ میں تشریف فرما ہیں۔ ابھی کھانا کھا کر اُٹھے ہیں۔ اس زمانہ میں کھانے کے بعد ایک سوڈے کی بوتل پیا کرتے تھے۔ نوکر بوتل کھول کر لایا۔ ایک ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ فرمانے لگے کھانے پر نمکین چیز نہیں پینی چاہیئے۔ بلکہ شیرینی کا استعمال مناسب ہے۔ اِس سے معدہ میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ جواب دیا۔ جب تک معدہ ضعیف ہوگا ہم قبر میں پہنچ جائیں گے۔ اب کیا رہا ہے جس کی فکر کریں

اب میں ایک سفر کے حالات بیان کرتا ہوں۔ جو ان کی معیّت میں پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حیدر آباد میں اعلیٰحضرت میر محبوب علی خان شاہِ دکن کی جوبلی کی تیاریاں ہیں۔ سر اکبر حیدری نے حالی کو حیدر آباد بُلایا ہے۔ منشا یہ ہے کہ میر محبوب علی پاشا کے عہد کی تاریخ اُن سے لکھوائی جائے۔ میرا بھی قصد حیدر آباد کا تھا۔ جشن میں شرکت کی غرض سے نہیں دیدارِ احباب کے لئے۔ چنانچہ جشن کے انعقاد سے قبل واپس ہو گیا۔ میری اور حالی صاحب کی تاریخِ روانگی میں اختلاف تھا۔ میں پابند وہ آزاد۔ میری خاطر جانا ملتوی کر دیا۔ غرض میری صحبت نہ تھی۔ سفر میں سہولت مدنظر تھی۔ عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے کوئی تن کا آدمی ساتھ ہونا ضرور تھا۔ بڑے صاحبزادے ساتھ تھے۔ حالی صاحب دنیا کے کاروبار سے بے خبر۔ صاحبزادے اُن سے بھی بالاتر۔ بالکل اللہ والے یہ استعارہ نہیں حقیقت ہے۔ میرن صاحب بھی ہم سفر ہیں۔ لائیے پہلے آپ کا میرن صاحب سے تعارف کرالیں پھر آگے چلیں۔ یہ وہی میرن ہیں جن کا ذکر جابجا رقعات غالب میں آتا ہے۔ حُسن وجمال میں فرد اور تُنک مزاجی میں یکتا۔ لازم وملزوم۔ آواز میں سوز۔ سوز خوانی اختیار کی۔ باکمال ہوئے۔ مَیں نے بُڑھاپے میں دیکھا ہے۔ روز کا آنا جانا تھا کھنڈر رہ گیا تھا۔ تاہم گذشتہ جاہ وجلال جھلک رہا تھا

دانت مفقود- آواز میں سوز وگداز موجود- فنِ موسیقی میں مہارت۔ ماہرانِ فن کو شرمندہ کرنے والی- غالب کی برکت سمجھیں یا سر اکبر حیدری کی قدر شناسی اور ہنر پروری یہ بھی اس موقع پر حیدرآباد طلب ہوئے- پھر حسبِ حیثیت وظیفہ سے فیض یاب بھی ہوئے - دعائے دولت واقبال میں آخری لمحہ زندگی کے آرام سے گذار کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے -

ہم دونوں سیکنڈ کلاس میں تھے اور میرن صاحب تھرڈ میں مگر دہلی سے منماڑ تک- وہاں سے ان کا بھی سیکنڈ کا ٹکٹ لے لیا گیا- یہاں کا ایک لطیفہ قابلِ عرض ہے -جو ریل براہِ اورنگ آباد جاری تھی اُس پر سوار ہوئے - اوّل تو چھوٹی لائن- اُس پر طرّہ یہ کہ ابھی کھلی ہے- حد بندی کے تار تک نہیں لگے - جگہ جگہ مویشی کٹے پڑے ہیں بہت سست چلتی ہے- دل اُکتا یا جاتا ہے-حالی صاحب نے میرن صاحب سے کہا- بھائی یہ تو جوں کی چال چلتی ہے -میرن صاحب کی طبیعت بات میں اضافہ کئے بغیر کیسے مانتی - وہ بولے- اے جناب یہ تو پیٹ والی جوں کی چال چلتی ہے - میں اور حالی صاحب یہ فقرہ سنکر ہنس پڑے - اسٹیشنوں پر انگریزی ہندوستانی کسی کھانے کا انتظام نہیں-توشہ ختم ہوچکا تھا- بھوکے نکلنا تے خدا خدا کر کے حیدرآباد پہنچے-

حالی صاحب اور میرن صاحب تو سر کلری مہمان تھے۔ لاجواب جوڑی گاڑی پر سوار ہو کر نظام کلب کے قصر مہنا کو فرّاٹے بھرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ہمارے لئے تلاوت علی پاشا جواب عالی مرتبت تلاوت جنگ بہادر ہیں۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی بروم گاڑی اُس میں مریل گھوڑا اجتا ہوا۔ حاضر تھی۔ ہم ٹخ ٹخ کرتے اُن کے گھر جا اُترے۔ گھر بھی کہنہ اور فرسودہ باپ دادا کے وقت کا۔ کہاں یہ اور کہاں نظام کلب۔ مگر یہاں اُلفت اور صلاح تھی اور وہاں جاہ و فلاح۔ خود سمجھ لیجئے کس کو ترجیح دینی چاہئیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اِن آنکھوں نے اب اُس گھر کو city palace دیکھا۔ اگر قدیم زمانہ ہوتا تو ہاتھی کھڑے جھومتے ہوتے۔ روشن چوکی بجتی ہوتی۔ اب ہاتھیوں کی جگہ موٹروں نے سنبھالی ہے اور روشن چوکی ان کے ہارن ہیں۔ یہی حضرت ہیں جن کی خاطر حیدرآباد کا سفر اختیار کیا تھا۔ اور کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ میں کہاں اور حیدر آباد کہاں۔ اس شہر سے الفت ضرور ہے۔ شباب یہیں آیا۔ تعلیم و تربیت یہیں کا طفیل ہے۔ مگر سوائے ان کی ذات کے کسی سے خاص تعلق نہیں یوں یاد اللہ تو بہت سوں سے ہے۔

اب ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں۔ چونکہ حالی صاحب کے ساتھ سفر کیا تھا۔ یہ لازمی تھا کہ کم سے کم ایک مرتبہ تو ان کی فرودگاہ پر حاضر

ہو جاؤں۔ میں گیا تو وہ خانہ باغ میں۔ درخت کے زیرِ سایہ تشریف فرما تھے۔ اور ایک نربدہ پار کے صاحب ہم صحبت۔ یہ صاحب اس زمانہ میں ریاست کے ملازم تھے۔ پھر ملازمت ترک کر دی۔ الحمدللہ اب بھی بقید حیات ہیں۔ نظم و نثر دونوں کے ماہر ہیں۔ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ساتھ کے ساتھ پرلے درجہ کے بدتمیز بھی ہیں۔ مَیں نے حالی صاحب سے کچھ کہا۔ پہلی ہی ملاقات اور فوراً اعتراض جڑ دیا۔ شاید دہلی والوں سے پر دل ہوں گے۔ حالی صاحب سے اپنے اعتراض پر تائید کے طالب ہوئے۔ مَیں نے صرف اِسی قدر جواب دیا کہ دہلی کا محاورہ یہی ہے۔ چونکہ حالی صاحب بھی مخاطب تھے فرمایا۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ اُس خاندان کا آدمی ہے کہ اگر غلط بھی بولے تو میں اسے صحیح تسلیم کر لوں گا۔ اور اپنی زبان کی اصلاح کروں گا۔ مَیں تھوڑی دیر بیٹھا مگر ان صاحب کی صحبت سے کبیدہ خاطر۔ اجازت لے کر رخصت ہوا واقعات بہت ہیں۔ اِس مختصر میں گنجائش نہیں۔

جس خط کا مَیں نے وعدہ کیا تھا یہ اُس کی نقل ہے۔ اصل میرے پاس موجود ہے :۔

پانی پت

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۱ء

عزیزی خواجہ صاحب۔

ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ قیصر ہند کا مرثیہ جو ایک رسالہ میں چھپا تھا اُس کو رسالہ میں سے نکال کر آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو بقدرِ امکان بہت جلد اس کا ترجمہ نثر انگریزی میں جس کا میں پہلے آپ سے ذکر کر چکا ہوں کر دیجئے۔ ترجمہ کو اس طرح لکھئے گا کہ ایک کالم اصل اردو کے مصرعوں کے لئے چھوڑ دیجئے گا اور مصرع کا اوّل لفظ اپنی قلم سے لکھ دیجئے گا۔ میں ہر ایک مصرع کو پورا کر لوں گا اور ہر اُردو کے مصرع کے مقابل انگریزی ترجمہ اُسی مصرع کا لکھئے گا۔

اِس ترجمہ میں آپ کو کسی قدر دقت نوٹوں کے لکھنے میں پڑے گی خصوصاً دوسرے بند کے اخیر شعر اور تیسرے بند کے سات شعروں کے نوٹوں میں مذکورہ ۸ بیتوں میں انجیل متی باب ۱۳ اور بابِ پنجم کی تلمیحات ہیں میں نے ہر ایک تلمیح کا پتا اُردو انجیل سے نوٹوں میں نقل کر دیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے اِن تلمیحات کو انگریزی انجیل سے اخذ کیجئے گا۔ اور چونکہ ہر فقرہ پر نمبر لگا ہوا ہے۔ انگریزی انجیل میں بہت آسانی سے پتا لگ جائے گا۔ اکثر بلکہ تقریباً کل درس عیسےٰ علیہ السلام کے پہاڑی

وعظ میں موجود ہے۔

چونکہ تیسرے بند کے نوٹ بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے جس رسالہ میں مرثیہ چھپا ہے وہاں بسبب عدم گنجائش کم ایک صفحہ کے دوسرے صفحہ پر لکھے گئے ہیں۔ آپ جہاں ترجمہ لکھیں اُسی کے نیچے فٹ نوٹ میں تمام حاشئے نقل فرما دیں۔ کاپی میں جہاں جہاں مناسب ہوگا لکھوا دیا جائے گا۔ اِس کام کے لئے مجھے ایک آدھ روز کے لئے خود آنا پڑیگا۔ زیادہ دعا۔

یہ تلمیحات سارے مرثیہ کی جان ہیں۔ یہ نوٹ ایسے طور پر چھپنے چاہئیں کہ ہر شخص بآسانی دیکھ کر سمجھ جائے کہ فلاں نوٹ فلاں تلمیح سے متعلق ہے۔

راقم خاکسار الطاف حسین حالی

مولوی عبدالحلیم شرؔر اور عزیز مرزا بی-اے
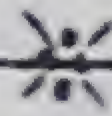
(۱۰)

اب ہماری عمر خاصی ہو گئی ہے - اردو خوب آ گئی - فارسی تھوڑی بہت پڑھ لی ہے - انگریزی کی بھی شُد بُد ہو گئی ہے - ساری پُرانی قصہ کہانیوں کی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں - نئی نئی ناول نویسی شروع ہوئی ہے - رینلڈ کا چربا اُتارا جا رہا ہے - یُوں تو گھر میں اردو کی طرح طرح کی کتابیں موجود ہیں - مگر والد مرحوم کو ناول بینی کا شوق نہیں - ان کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں - پھر یہ کتابیں کہاں سے آئیں - ہم ناول پڑھنے کے شوقین - باوا سے کہیں تو کیونکر کہیں یقینی ناگوارِ خاطر - اگر ہماری ناول بینی کی بھنک بھی اُن کے کان تک پہنچ جائے گی تو ایک ایک سے کہیں گے اور سنو صاحبزادے اِتنی سی عمر میں عاشق مزاج ہیں - ناول پڑھتے ہیں عشق بازی کی گھاتوں میں دلچسپی لیتے ہیں - خدا خیر کرے - مردے از قلعہ برون آید و شب سیر کند - خبر رفت از درِ تیمور خدا خیر کند -

اِس زمانہ میں ہمارے ایک ہم سبق ہیں - ان کا نام محمد یوسف ہے اِسم با مُسمّٰی ہیں - ہم سے عمر میں کچھ بڑے ہیں - خط لاجواب - اُردو کی تحریر بے مثل - ان کے مکتوب حفاظت سے رکھے تھے مگر چوری گئے

یہ مقننِ دکن کے صاحبزادے ہیں۔ آپ پوچھیں گے مقننِ دکن کون ؟
ہم بھی ان کا نام نہیں جانتے۔ ان کا اصلی نام کسی کو معلوم ہی نہیں۔ اِسی
نام سے مشہور ہیں۔ گھر کے باہر قدم تک نہیں نکالتے۔ کبھی ان کی صورت
بھی نہیں دیکھی مقننِ دکن رسالہ نکالتے ہیں۔ اچھّی کمائی ہے۔ اِسی پر
گزرِ اوقات ہے۔ ان کی زندگی پُراسرار ہے۔ راز سے ہم واقف ہیں۔
پردہ دری ہمارا شیوہ نہیں۔ یہ عزیز مرزا کے بہنوئی ہیں۔

عزیز مرزا اس زمانہ میں ہوم سیکریٹری کے مددگار ہیں۔ آگے
چل کر خود ہوم سیکریٹری ہوں گے پھر اخراج ہوگا۔ وہ بھی پُراسرار
طریقہ پر۔ بسر سے ہم واقف ہیں۔ ابھی تک اِس ڈراما کے چند ایکٹر زندہ
ہیں۔ اور ہمارے دوست ہیں۔ اگر بیان کر دیں تو دنیا ہمارے قول کو
باور کرلے گی۔ اور ان کی پول کھل جائے گی۔ سخت شرمندگی ہوگی۔
دوستی میں فرق آجائے گا۔ خموشی افضل ہے۔

آمدم بر سرِ مطلب۔ اِس وقت کے مقبولِ عام ناول نویس۔
عبدالحلیم شرر ہیں۔ یہ عزیز مرزا کے بڑے دوست۔ حیدرآباد میں موجود
ہیں۔ محمدؐ یوسف کی وجہ سے عزیز مرزا کے ہاں کا روز کا آنا جانا شرر سے
ملاقات ہوگئی۔ اِن کے ناول اپنے یار سے لے کر پڑھے بہت پسند
آئے۔ بار بار پڑھے۔ ایک مرتبہ محمدؐ یوسف کے ساتھ اِن کے ہاں

دعوت بھی کھائی۔ ہم تو طُفیلی تھے۔ دعوت تو محمدؐ یوسف کی تھی۔ یہ پرلے پار رہتے ہیں۔ سکندرآباد سے بھی آگے ایک بستی ہے وہاں جانا پڑا۔ سواری محمدؐ یوسف کے ماموں کی گاڑی۔ شرر صاحب سے بارہا صحبت رہی۔ مگر کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔ پھر محمدؐ یوسف کا عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ ایں ماتمِ سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ یہ صحبت درہم و برہم ہو گئی۔ پہلے سے ہی ہو چکی تھی۔ ابتدائی جماعتوں ہی سے محمدؐ یوسف نے تعلیم ترک کر دی تھی۔ بیچارہ مجبور تھا۔ باوا کو روپوش ہونا پڑا قصہ طویل ہے۔ سارے خاندان کا بار اس کے سر پر آن پڑا۔ رسالہ خود نکالنے لگا۔ محنت برداشت نہ ہوئی۔ کمزور تھا۔ سل ہو کر مر گیا۔

اب ہم دہلی آ گئے۔ برسوں عبدالحلیم شرر کی صورت نہیں دیکھی۔ یکایک ایک دن غریب خانہ پر آ موجود ہوئے۔ فرمایا لڑکے کو لایا ہوں۔ وہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر انصاری اُس کا operation کریں گے۔ پچھلی والان میں اُترے ہوئے تھے۔ بارہا ان سے ملنے حاضر ہوا۔ لڑکا خدا کے فضل سے اچھا ہو گیا۔ وہ چلے گئے۔ جانے کے چند سال بعد رحلت فرمائی۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔

اب ان کا حُلیہ بھی عرض کئے دیتا ہوں۔ پستہ قد۔ بھاری بدن گندمی رنگ۔ نقشہ بھدا۔ ہمیشہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے

نظر آتے ہیں ۔ پاجامہ تپلون نما۔ ٹخنے کھلے ہوئے۔ کیا عجب ہے عقائد میں اہلِ حدیث کے پیرو ہوں ۔ میں نے حاجی عبد الغفار (منیجر کوٹھی حاجی علیجان) کی زبانی سنا ہے کہ میاں صاحب مولانا نذیر حسین محدث کے درس میں ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے ۔ قیافہ ذہانت پر دلالت نہیں کرتا۔ سنا ہے ذی علم تھے ۔

اب عزیز مرزا کا حال سنئیے ۔ محمد یوسف کی وفات سے پہلے ہم اپنے دوست کی خاطر اکثر ان کے ہاں آتے جاتے ۔ یہ بہت التفات سے پیش آتے ۔ بزرگانہ کرم کرتے ۔ محمد یوسف کے مرنے کے بعد بھی دو ایک مرتبہ حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ۔ محبت اور التفات میں کمی نہ پائی ۔ ایک دن کا ذکر ہے ۔ اسی زمانہ میں مَیں نے مڈل کا امتحان دیا تھا۔ عزیز مرزا ترجمہ کے ممتحن تھے ۔ فرمانے لگے تمھیں Rod کے معنی معلوم نہیں ۔ غلط ترجمہ کیا ہے ۔ میں آنکھیں نیچی کر کے خموش ہو رہا۔ ایک اور صاحب وہاں تشریف فرما تھے ۔ عمر رسیدہ ۔ یہ صاحب فارسی کے شاعر بھی ہیں ۔ نام کبھی نہیں سنا ۔ امیر تخلص کرتے تھے ۔ جیسا ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کا خاصہ ہے ۔ اگر بڑا آدمی ایک بات کہے تو یہ اُس کی ہاں میں ہاں ملانے کو چار باتیں کہیں ۔ انہوں نے لایعنی بکواس شروع کر دی ۔ کچھ عزیز مرزا سے مطلب ہوگا۔ اُن کو خوش کرنا چاہتے ہوں گے ۔ یہی صاحب چند ماہ بعد

والد مرحوم سے ملاقات کرنے آئے۔ کوئی غرض ہوگی۔ والد گھر پر نہ تھے۔
ہم موجود تھے۔ یہ شعر پرچہ پر لکھکر چھوڑ گئے۔ بندہ امیر آمد و محروم
بازگشت۔ بے آنکہ دید صورتِ مخدوم بازگشت۔ ہم نے کاغذ اُن سے
لے لیا اور باوا کو دیدینے کا وعدہ کیا۔ پھر ہم نے اُن کی انگریزی دانی
کی تعریف کی اندر جا Macaulay's essay on lord clive
لے آئے۔ یہ اس زمانہ میں ہم سید عبدالمجید صاحب سے پڑھ رہے تھے
اور اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان سے کہا ذرا ہمیں اس میں سے دو ایک فقرہ
بتا دیجئے۔ ان کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ شرمندہ ہو چپ اُٹھکر
چلے گئے۔ دوبارہ میں نے اُن کو آتے نہیں دیکھا۔ نہ اور کسی جگہ اُن سے
ملاقات ہوئی۔

اب ہم دہلی آگئے ہیں۔ عزیز مرزا ہوم سیکرٹری کے عہدۂ جلیلہ پر
فائز ہیں۔ حیدرآباد جانا ہوا۔ ان کی قدیم مہربانیاں یاد آئیں۔ کچھ محمد یوسف
کی یاد۔ ہم ہوم آفس جا پہنچے۔ اطلاع کرائی۔ فوراً بلا لیا۔ اب
یہ بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ صحت بھی خراب معلوم ہوتی ہے۔ رنگ دھویا
کپڑا نکل آیا ہے۔ سرخی کا پتہ نہیں۔ پہلے بہت پان کھاتے تھے۔ ہر وقت
گلوری کلّے میں دبی رہتی تھی۔ اب جو دیکھا تو مُنھ خالی دانت سفید۔
عرض کی یہ کیا بات ہے۔ فرمایا میں بیمار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے پان کو

منع کیا۔ اب میں نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اس زمانہ میں ان کی اور میرے ایک دوست کی سخت مخالفت تھی۔ دونوں پایہ کے آدمی تھے۔ اُنکی جانب سے اِن کو ہر وقت اندیشہ رہتا تھا۔ مجھ سے صلح صفائی کے طالب ہوئے میں نے عرض کی کہ آپ کی اور اُن کی سیاسی دشمنی ہے۔ آپ بزرگ ہیں وہ دوست۔ میں اِس معاملہ میں قدم رکھنا نہیں چاہتا معلوم نہیں آئندہ کیا اُفتاد پڑے اور مجھے شرمندگی ہو۔ چنانچہ جو میں نے کہا تھا وہی پیش آیا۔ اِس کے چند سال بعد عزیز مرزا کا ریاست سے اخراج ہو گیا۔ یہاں آکر مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ پھر صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ صرف ایک خط انکے پاس سے آیا تھا۔ وہ میرے خط کے جواب میں تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں میرے باوا اور چچا (نوّاب ننھے خاں صاحب) اور حکیم محمّد اجمل خان میں سخت مخالفت ہو گئی تھی۔ لوگوں کی در اندازی اس کا باعث تھی۔ اسمیں مرزا حیرت اور ذکر الرحمٰن وکیل کا ہاتھ تھا ورنہ یہ سب کے سب بڑے شریف تھے۔ اور صدیوں کے خاندانی تعلقات تھے۔ میں نے چاہا کہ عزیز مرزا دلی آکر صفائی کرا دیں۔ خط میں وعدہ بھی فرمایا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اگر آجاتے تو پھر دیدار ہو جاتے۔ اب تو اللہ میاں کے ہاں ملنے کی امّید ہے۔

وہی صحبتیں اور وہی یار ہوں گے　　مرے مولیٰ پھر سے وہی لائینگے دن

حکیم محمود خان

(۱۱)

حکیم صاحب مطب کر رہے ہیں۔ شمال رُویہ دالان خالی پڑا ہے مطب سامنے کے دالان میں ہو رہا ہے۔ دالان سطح صحن سے کوئی چار فٹ بلند ہے۔ پہلو میں سیڑھیاں ہیں۔ سامنے کٹہرا لگا ہوا۔ نیچے مونڈھے پڑے ہیں مطب کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ مونڈھوں پر بھی کچھ مریض بیٹھے ہیں۔ کٹہرے کے برابر دالان کی لب پر حکیم صاحب گاؤ تکیہ لگائے مسند پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے کلی رکھی ہے۔ پیکدان اور خاصدان بھی حاضر ہے صورت ملاحظہ ہو۔ میانہ قامت۔ گورا رنگ۔ سرخی پڑی جھلک رہی ہے۔ بھرا ہوا بدن۔ ورزشی معلوم ہوتا ہے۔ سر ڈاڑھی بالکل سفید ڈاڑھی موچھیں چڑھی ہوئیں۔ چہرہ پر ناک قابلِ لحاظ خوش نما ہے۔ اور خاص طرز کی۔ بیان کے لئے موزوں الفاظ میرے پاس نہیں۔ تصویر موجود ہے جو چاہے دیکھ لے۔ سر پر دوپلڑی ٹوپی۔ بدن میں شبنم کا انگرکھا۔ کرتہ ندارد۔ یہ کرتنی ہے۔ عورتیں پہنتی ہیں۔ یہ حکیم صاحب کا قول ہے۔ زمانہ کا رواج بھی یہی ہے۔ سامنے نسخہ نویس بیٹھے ہیں ہاتھ میں حنائی کاغذوں کی لمبی لمبی پٹیاں ہیں۔ یہ شاگرد ہیں۔ جس کی طرف اشارہ

ہوتا ہے۔ نسخہ لکھ کر پیش کرتا ہے۔ پڑھا اور مریض کے حوالہ کیا۔

ہم باوا کے ساتھ داخل ہوئے۔ باوا ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ میں برابر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر گزری حکیم صاحب متوجہ ہوئے۔ عبدالرحیم تو کب آیا۔ دادا صاحب کے ملنے والے ہیں۔ میرے باوا کو اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ عرض کی پرسوں حیدرآباد سے آیا ہوں۔ اچھا تو ہے۔ الحمدللہ خدا کا فضل ہے۔

(باوا کو قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ہمیشہ صفراوی دستوں کا دورہ پڑتا تھا ہفتہ عشرہ جاری رہتے اسی شکایت کا علاج مقصود تھا) پوچھا کوئی شکایت ہے۔ عرض کی دست آتے ہیں نبض ملاحظہ فرمائی۔ نسخہ لکھوا کر دیا۔ نسخہ ہاتھ میں لے کر باوا نے کہا حیدرآباد میں آڑو نہیں ہوتے مجھے بہت بھاتے ہیں۔ آج کل ان کی فصل ہے۔ اجازت ہو تو کھاؤں فرمایا نسخہ دکھا۔ لے کر چاک کر دیا اور کہا جا آڑو کھا۔ حکیم صاحب بڑے نازک مزاج۔ باوا سمجھے خفا ہو گئے۔ عرض کی نسخہ عنایت ہو۔ آڑو نہیں کھانیکا بولے نہیں کھا۔ یہی تیرا علاج ہے۔ نسخہ کی ضرورت نہیں۔ ہم وہاں سے واپس ہوئے۔ راستہ میں سے آڑو خرید لئے اور اسی دن سے کھانے شروع کر دیئے۔ چند روز میں دست بند ہو گئے۔ باوا اچھے ہو گئے۔

چند سال بعد پھر دہلی آنا ہوا۔ غلام محمد حسن خان اور ابوالحسن خان میرے چچازاد بھائی۔ فرّخ مرزا میرے پھوپی زاد بھائی۔ ہم سب مل کر سیر کرنے ریواڑی گئے۔ شام کو واپس آئے۔ فرّخ مرزا کو بخار ہو گیا یہ اپنے ماں باپ کا ایک بیٹا بیٹیاں دو اور بھی تھیں۔ مرض نے طول پکڑا۔ حکیم محمود خاں کا علاج شروع ہوا۔ یہی سارے شہر میں نامی نامدار حکیم۔ محدّب جگر میں ورم۔ اکیسویں [۲۱] دن رخصت ہوئے۔ یہ مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ ان کی عمر تیرہ [۱۳] چودہ [۱۴] برس کی تھی۔ سارے خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ ان کے مرنے کے دوسرے دن مجھے بخار چڑھ آیا۔ سب متردّد ہو گئے کہ اب یہ بھی چلا۔ باوا حکیم محمود خاں کو لانے گئے۔ شام کا وقت ہے۔ جاڑوں کے دن۔ مجھے اندر کے دالان میں رکھا گیا ہے۔ تینوں دروں پر پُنیئی پردے پڑے ہیں۔ اندر چراغ روشن۔ مغرب کے قریب کا وقت۔ حکیم صاحب تشریف لائے آخر کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ باوا پیچھے پیچھے۔ قدم رکھتے ہی معاً فرمایا۔ اسے تو کچھ نہیں۔ خسرا کا بخار ہے۔ خدا معلوم ان کی ذکی الحس ناک میں خسرا کی بو گئی۔ یا الہام ہوا۔ دوسرے دن خسرا نمودار ہو گئی۔ کھڑے کھڑے نبض دیکھی اور چلے گئے۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ میری پالنے والی بڑھیا۔ بی شبّو ہفتاد سالہ

سب کی پیاری - مہاوٹیں پڑ رہی ہیں - تین چار دن سے سورج کو آنکھیں
ترس گئی ہیں - آسمان کی بوند تھمتی ہی نہیں - سردی الامان - بی شتبو کو
نمونیا ہو گیا - باوا حکیم صاحب کو اسی مینھ میں بیج گاڑی پر سوار کر کے
لائے - مریضہ کو دیکھا اور رنگترے کھانے کو بتا گئے - یہ رنگترے کی
فصل تھی - دہلی میں بہت بڑا رنگترا ہوتا تھا - مگر پھوکا - مے خوش -
اس کا راحتِ جان بنا کر ان کو دیا گیا - اللہ نے اپنا فضل کیا تندرست
ہو گئیں -

ان کے معالجات کے واقعات بہت ہیں جو سب معجز نُما ہیں -
شرافت اور دیانت کا یہ شخص پُتلا تھا - مگر یہ سب سماعی ہیں گرچہ
شہادت قوی ہے - تاہم قلم انداز کئے جاتے ہیں -

حکیم محمّد واصل خان

(۱۲)

حکیم محمُود خان کے بعد اُن کے فرزندِ اکبر حکیم عبد المجید خان جانشین ہوئے۔ گھر کا نقشہ بدل گیا۔ سارے امیرانہ ٹھاٹ ہو گئے میانہ قد۔ گھوڑا ریاست جیند کا عطیہ سواری میں نہیں رہا۔ جوڑی گاڑیاں آگئیں۔ لباس کی تراش خراش رئیسوں کو بھی مات کرے۔ کپڑے لکھنؤ سے دُھل کر آتے ہیں۔ دن میں دو دو بار جوڑے بدلے جاتے ہیں۔ درزی بیٹھا ہے۔ انگرکھے پر پتّی کا کام بنا رہا ہے۔ برس دن میں تیار کر کے دے گا۔ انگریزی طرز کے نام و نمود کی طرف طبیعت راغب ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ خود کردہ را چہ علاج۔

اب حکیم واصل خاں کی باری آئی۔ ٹھاٹ وہی رہے۔ قدرے کم۔ امارت آئی۔ سادگی رخصت ہوئی۔ بھائی کے ہمنشین ان کے ہمنشین بن گئے۔ کسی کو بلا ہاتھ پاؤں ہلائے حکیم صاحب کی بدولت پیٹ پالنے کی فکر ہے۔ کوئی چہچہے قہقہوں میں وقت کاٹنا چاہتا ہے۔

حکیم صاحب باوا کے گھر کے دوست۔ بندہ کے بزرگ۔ بزرگانہ شفقت اب تک آٹھ آٹھ آنسو رُلا رہی ہے۔

صبح سویرے باوا کے پاس آدمی آیا۔ حکیم صاحب پھول والوں کی سیر میں جائیں گے۔ لڑکے کو لے کر آ جاؤ۔ تاکید ہے لڑکے کو ضرور لانا دس گیارہ بجے ہم کھا پی کر جا پہنچے۔ سواریاں تیار ہیں۔ حکیم صاحب مع حوالی موالی کے روانہ ہونے کو ہیں۔ مطب خاتمہ پر ہے دیگمنٹ گاڑی اُس میں جوڑی جُتی ہوئی۔ حکیم صاحب خود ہکار رہے ہیں اور گاڑیاں ساتھ ہیں۔ کچھ اپنی کچھ مانگے کی۔ ہم حکیم صاحب کی گاڑی پر سوار ہیں۔ دھوپ پڑ رہی ہے۔ اَبر کا پتا نہیں۔ راستہ بھر حکیم صاحب کے شوربے۔ کارخانہ دار صاحب فرماتے جاتے ہیں۔ آسمان کی جڑیں بھری ہوئی ہیں۔ اب اَبر آیا۔ یہ اُن ہی کے الفاظ ہیں۔ اَبر کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ جلتی بھلتی ہیں قطب صاحبؒ جا اُترے۔ نوّاب احمد سعید خان صاحب مرزا بابر کی کوٹھی میں جا جا کر رہتے ہیں۔ یہ ان ہی کی ملکیت ہے۔ اب بھی وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب مع رفقاء اُن کے مہمان ہیں۔

کھانے کی دعوت نہیں۔ حُقّہ۔ پانی۔ پان پتّے سے تواضع ہو رہی ہے۔ اور چیزیں بھی ہیں۔ دوپہر وہاں گزاری۔ ایسے موسم میں سیر کیا خاک ہوتی۔ شام ہوتے رخصت ہوئے۔

بس یہی پھول والوں کی سیر تھی جو عمر بھر میں دیکھی۔ وہ بھی

حکیم صاحب کی بدولت۔

دوسرا واقعہ۔ میں ایک دوست کے مکان میں گر پڑا۔ گھٹنہ میں سخت ضرب آئی۔ ڈولی میں ڈال کر گھر لائے۔ ڈاکٹر ذُوالنُّون احمد شہر کے مشہور ڈاکٹر پہلے بڑے فوجی ڈاکٹر تھے۔ پنشن لی۔ ہمارے شہر کی ایک لڑکی سے شادی کی یہاں متوطن ہو گئے۔ اصل میں آسام کے باشندے ہیں۔ ان کا علاج شروع ہوا۔ علاج میں بے عنوانی ہوئی۔ تکلیف میں اشتداد۔ ایک رات دماغ مختل ہو گیا۔ رات جُوں تُوں گزاری۔ علی الصباح والدِ مرحوم حکیم صاحب کو لائے شکایت کی رات ہی کو کیوں نہیں لائے۔ مسکّنات کا نسخہ لکھا۔ اپنے کمن گر سے مالش شروع کرائی۔ بار بار بغیر بُلائے دیکھنے تشریف لاتے۔ طرح طرح کی تدبیریں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ تاہم چال میں جھبک باقی رہ گئی۔ اب بڑھاپے میں یہ چوٹ رنگ لا رہی ہے۔ یہی باتیں ہیں جو یاد آتی ہیں اور خون کے آنسو رُلاتی ہیں۔

اور سُنئے۔ بمبئی کسی امیر سیٹھانی کے علاج کو بلائے گئے۔ وہاں سے آئے تو میرے لئے وِیل مچھلی کی کھال کی چھڑی لائے۔ اور چیزیں بھی تھیں۔ لکڑی خراب ہو گئی۔ باقی چیزیں ختم ہو گئیں۔ ہاں ایک چیز اب تک باقی ہے۔ جان کے برابر عزیز رکھتا ہوں۔ یہ بانس کی

لکڑی ہے۔ بانس نادر ہے۔ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ رام پور کا تحفہ ہے۔ نواب جس کو چاہے دے۔ قیمتاً دستیاب نہیں ہوتی۔

جاڑا اشدّت کا پڑ رہا ہے۔ مگر مطلع صاف ہے۔ سبزی منڈی کے کسی باغ میں حکیم صاحب نے اسمٰعیل خان سفیرِ کابل کی دعوت کی ہے۔ بندہ بھی مدعو ہے۔ باغ کے دروازے کے سامنے چبوترہ ہے۔ اس پر حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ شام کا وقت ہے۔ ابھی سفیر صاحب نہیں آئے۔

یہاں ان کی صورت اور لباس کا نقشہ پیش کرتا ہوں۔ اپنے والدِ مرحوم حکیم محمود خان کی تصویر ہیں۔ قد کسی قدر لمبا۔ بدن اُتنا بھرا ہوا نہیں۔ بال سیاہ بھُرّاں۔ خضاب کی فریب کاری۔ بدن میں کمخواب کا انگرکھا۔ کمخواب کی بیل ٹکی ہوئی۔ اوپر پوستین کا جُغہ ٹخنوں تک۔ پوستین شیر و شکر۔ نیلی مخمل کا ابرا۔ انگشتنیہ لیس ٹکی ہوئی سر پر مغرّق کارچوبی کام کی ٹوپی۔

باغ کے دروازہ پر کئی کمرے ہیں۔ سب آراستہ۔ وہاں یاروں کی ٹولی بیٹھی ہے۔ ایک بی صاحب اپنی ایک قریب بہ بلوغ صاحب زادی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا نام لکھ دیتا مگر چند در چند وجوہ سے نامناسب ہے۔ چھوٹی بی صاحب آگے چل کر بڑی شہرۂ آفاق بیگم صاحبہ

ہوگئیں - ایک کروڑ پتی ہندو کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ اس دن کے بعد پھر کبھی ان کے دیدار نہیں ہوئے - یہاں تک کہ چل بسیں - میں اپنی بدقسمتی سے وہاں جا پہنچا۔ صحبت میں سب بڈھے بڈھے تھے جو گفتگو ہو رہی تھی - میں برداشت نہ کر سکا۔ نیچے اُتر حکیم صاحب سے اجازت لے گھر چلا آیا - وہ میری طبیعت سے واقف تھے۔ روکا تک نہیں اجازت دے دی - سارا معاملہ بغیر عرض کئے میرے بُشرہ سے سمجھ گئے۔

ایک دن کسی ضرورت سے مطب میں جانا ہوا - صبح کا وقت گرمی کے دن - مطب چھتہ میں ہو رہا ہے بیلیں چڑھی ہوئی ہیں مونڈھے پر تشریف فرما ہیں - اور مونڈھے رکھے ہیں - ایک قریب کے مونڈھے پر جا بیٹھا - سامنے ایک اور نوجوان صاحب بیٹھے ہیں - انگریزی لباس ہے - میں نوجوانی میں بہروپیا تھا - اُس زمانہ کے رنگ کے خلاف میں انگریزی ٹوپی تک سے ہچکچاتا نہ تھا - مگر جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ٹھیٹ دیسی کپڑوں میں - آج بھی اچکن اور غرارہ پائجامہ پہنے ہوئے تھا - ان صاحب کو مخاطب کر کے کہا - یہ ایم - اے میں پڑھ رہا ہے - کیسے کپڑے پہنتا ہے اور تم اپنے تئیں دیکھو - اُن کو میری وضع قطع پر اعتبار نہیں ہوا - مجھ سے پوچھا صحیح ہے - میں نے کہا

جی ہاں - وہ علی گڑھ کالج میں کسی ادنیٰ جماعت میں پڑھتے تھے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی - انہوں نے میرے غرارے پائنچہ پر اعتراض کیا - فرمایا یہ تو ہم بھی پہنتے ہیں - ہمارا قدیمی لباس ہے - میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ آج تو بات بن گئی - خدا کرے کبھی حکیم صاحب مجھے دوسرے فیشن میں نہ دیکھ لیں - نہیں تو بڑی کرکری ہو گی -

خدائے تعالیٰ اغریقِ رحمت کرے - ایسے محبّت کے آدمی پیدا نہیں ہوتے -

---
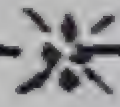
خان بہادر ڈاکٹر حکیم اللہ پشاور والے

(۱۳)

ان کی موت کہنی اور گھٹنے کی چوٹ نہیں۔ لگی تو آنکھوں کے آگے چکا چوند آگئی۔ ذرا سہلا لیا۔ پھر کچھ نہیں۔ یہ دل کی چوٹ ہے۔ وہ بھی تازی۔ مرے ہوئے کوئی دو برس ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے نیکی کنوئیں میں بھی نہیں ڈوبتی۔ یہ شخص نیک تھا اور مصداقِ آدمیت

مدّت سے روابط چلے آتے تھے۔ بیوی بچہ آتے جاتے رہتے تھے۔ خود بھی آتے تھے۔ خط و کتابت جاری نہ تھی۔ ہم بیکار دن بھر میں طومار کے طومار لکھ ماریں۔ وہاں فرصت کہاں۔ جان تک کے بھی ہوش نہیں۔ اشغال خلق اللہ کی خدمت۔ خادم القوم مخدومؒ اگر ضرورت آپڑی اور لکھا۔ بہ واپسی ڈاک جواب آیا۔ تار پر جواب آیا۔ کام ہوئے کا ہوا تھا۔ نہیں کی تو گنجائش ہی نہیں۔ تعویق تک نہیں۔

شفیع میاں کی شادی ہوئی ہنی مون کے لئے پشاور تجویز ہوا۔ کچھ وجہ نہیں۔ صرف حکیم اللہ وہاں ہیں۔ ہر طرح کا آرام ملے گا۔ مہماں نوازی ایسی ہو کہ باید و شاید۔ ان کے ساتھ جو

سلوک ہوا وہ سماعی ہے ہم نہیں لکھیں گے۔

ان کی زبانی سوات کی وادی کی خوشنمائی کے قصّے سُنے کتابوں میں پڑھے۔ اخباروں میں دیکھے۔ ہندوستان میں غوطۂ دمشق ہے۔ اُس سے بھی افضل۔ کچھ حکیم اللہ سے ملنے کا شوق۔ کچھ اُس وادی کے دیکھنے کا اشتیاق۔ ہم گھر گھُسنے بھی پشاور روانہ ہوئے تار دے کر اطلاع دے دی۔

اٹک کے اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب موجود۔ پہلے سے منتظر کھڑے ہیں۔ پائے غرض درمیان نہیں۔ صرف دوستی کا پاس۔ مہماں نوازی کی خُو۔ شام ہوتے پشاور میں داخل۔ گھر پر دعوت کا انتظام۔ تیس چالیس آدمی مدعُو۔ سب ہماری خاطر انسے تعارف کرائینگے ہم گُم نام سہی مگر ان کے مہمان ہیں۔ دستر خوان وسیع ہر کھانے پر دس پانچ آدمی موجود ہیں۔ سب سے خُلق اور مروّت کا برتاؤ۔ رجوع کا یہ حال۔ ایک ہاتھ رکابی میں دوسرا نبض پر۔ بلا مبالغہ عرض ہے۔ اکثر پیش آیا ہے۔ نسخہ لے جاؤ۔ دوا مفت لے لو۔ ہسپتال کی ایک Dispensary چوبیس ۲۴ گھنٹے ڈاکٹر حکیم اللہ کے نسخے بنانے کے لئے کھُلی ہے۔ شہر بھر میں میڈیکل ہال کا کال۔ ان کی ضرورت ہی کیا۔ حکیم اللہ کو خدا سلامت رکھے۔

ہسپتال میں مریضوں کی فوج کی فوج بیٹھی ہے۔ اور ڈاکٹر موجود۔ مگر سب کی سرد بازاری۔ چلتی تو ان ہی کی ہے۔ جو آتا ہے حکیم اللہ کا نام جپتا ہوا آتا ہے۔ ہسپتال کا ایک حصّہ ان کے لئے مخصوص۔ وہ آباد۔ باقی سب کے مطب سونے پڑے ہیں۔ برآمدہ میں میزیں رکھی ہیں۔ آگے اسٹول۔ مریضوں کی قطار بیٹھی ہے ان کے Injection لگیں گے معمولی نہیں Intervenus حکیم اللہ آئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک Injection لگاتے چلے گئے۔ گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہو رہے ہیں۔ آگے X ray کا کمرہ لیں۔ مریض آیا X ray کیا اور چل بھائی۔ ایک Apparatus کے درست کرنے میں گھنٹوں درکار ہوتے ہیں۔ اس خدا کے بندہ کا Apparatus فرشتہ درست کر جاتے ہوں گے۔

رات کا وقت ہے۔ میرے پاس آئے۔ چلو۔ کہاں چلوں۔ ذرا سیر کرا لائیں۔ باہر نکلا تو موٹر حاضر ہے۔ دیکھتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ موٹر کا ہے کو ہے تختِ نمرود ہے بیٹھ روانہ ہوئے۔ ایک عالی شان کوٹھی پر جا اُترے۔ یہ کس کی ہے۔ جوڈیشل کمشنر کی۔ یہ صاحب صوبہ سرحد کے ہائی کورٹ ہیں۔ مجھے Sitting room میں

بٹھا۔ آپ کمشنر کے ساتھ زنانہ میں داخل۔ کمشنر صاحب پیچھے پیچھے
مؤدب چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاٹھ صاحب آ گئے۔
تھوڑی دیر میں رخصت۔ گاڑی تک چھوڑنے کو کمشنر صاحب حاضر۔
اب ڈاکٹر صاحب کا لباس ملاحظہ ہو۔ جس دن سے میں گیا
اور جب تک وہاں رہا ایک ہی لباس میں دیکھا۔ گرے فلالین کی
پتلون۔ گھٹنے پر پیوند لگا ہوا [illegible] کا میلا سا
کوٹ۔ نکٹائی ندارد۔ جوتے پر نومن خاک۔ اسی ہیئتِ کذائی میں
میرے ساتھ کئی ٹی پارٹیوں میں بھی گئے۔
ایک کا حال بیان کئے دیتا ہوں۔ ہسپتال میں T.B کا نیا
ward کھولا جائے گا۔ ان ہی کے مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے
لاٹھ صاحب افتتاح کی رسم ادا کریں گے۔ ہمیں ساتھ لے روانہ ہوئے
وہاں بھی یہ ہی نظر آتے ہیں۔ سب ان کے سامنے بچھے جاتے ہیں۔
مجھے ایک خان کے سپرد کر دیا۔ خود کام میں مصروف ہو گئے۔ یہ خان
آزاد علاقہ کا تھا۔ سب سوٹ بوٹ میں۔ مگر یہ حضرت کُرتہ صدری
اور چپل پہنے ہوئے۔ صورت سے وقار نمایاں ہے۔ ہر حرکت
شریفانہ۔ ہر بات سمجھداری کی۔ اوروں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان
میں سرکاری ملازم بھی تھے اور وکلا بھی۔ سب خودستا خودفروش۔

سوائے ارباب لوگوں کے یہ سب شریف مہماں نواز باادب باوقار ان کا بچہ بچہ آدمیت کا پُتلا۔ اکثر ذی علم۔ ان کے ہاں بھی پارٹیوں میں جانا ہوا اور کھانے پر بھی۔

جگہ جگہ ہماری دعوتیں ہوئیں۔ تحفہ آئے۔ سب ڈاکٹر صاحب کی بدولت۔ ہم کس گنتی میں ہیں۔ بس گنتی یہی ان کے مہمان اور دوست میرے ساتھ سیر میں زیادہ نہ رہ سکے۔ دوسرے لوگوں کو ساتھ کر کے سیریں کرائیں۔ وجہ یہ کہ کئی مریض جاں بہ لب ہیں۔ ان کا موجود رہنا ضروری۔ ہمارا کوئی حرج نہیں۔ ان کا نام۔ ساری سرحد پر وردِ زبان۔ سوات بھی بھیجا۔ وہاں خان بہادر عبدالرحیم خان وزیرِ سوات کے مہمان رہے۔ والیٔ سوات موجود نہ تھے۔ شکار پر گئے ہوئے تھے۔

اب سوات کی وادی کا ذکر سُنئے۔ دریائے سوات بہ رہا ہے۔ خاصا چوڑا پاٹ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سڑک جا رہی ہے اچھی بنی ہوئی ہے۔ سڑک کے ایک سرے پر سر بہ فلک پہاڑ ہیں۔ دوسری جانب افق پر۔ درمیان میں دریا پار میدان۔ پہاڑ برف پوش۔ اِدھر لالہ خود رو۔ اُدھر کشتِ لالہ۔ دونوں رُخ لالہ زار۔ میلوں تک یہی سماں۔ ہوا روح افزا۔ پانی آبِ حیات

ساری سرزمین سبز اور شاداب۔ چپّہ چپّہ پر قلعہ موجود۔ ہر جگہ ٹیلیفون۔ سوات کا شہر چھوٹا مگر صاف ستھرا۔ سارے محکمے منتظم۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

ایک دن اپنے ساتھ کشتی میں دریائے کابل کی سیر کو لے گئے سارے دن سیر کی۔ بہت سے آدمی ساتھ تھے۔ بندوقیں بھی تھیں چلائیں بھی۔ کوئی مرغابی مری نہیں۔ نہ میں نے بندوق چلائی نہ ڈاکٹر صاحب نے۔ ارباب لوگ چلا رہے تھے۔ شام کے وقت ہوا تیز ہوگئی۔ کشتی چھوٹی۔ خطرہ پیدا ہوگیا۔ مگر ہمیں کیا۔ ہم تو پانی کی مچھلی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بے شک تیرنا نہیں جانتے۔

غرض نوشہرے جا پہنچے۔ وہاں سے موٹروں پر سوار ہو واپس ہوئے۔ باڑے کی ندی کے پانی اور پشاور کی آب وہوا کا کیا عرض کروں دہلی سے بگنا کھانے لگا۔ پھر بھی طبیعت سُبک۔ دل چونچال۔ خدا معلوم یہ وہاں کی آب وہوا کا اثر تھا یا ڈاکٹر صاحب کی نیک نیتی اور محبّت کا۔ پھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اب نہ ڈاکٹر صاحب پیدا ہوں گے نہ ہم جائیں گے۔ اگر گئے بھی تو آنسو بہا آئیں گے۔

خدائے تعالیٰ اُن کی اولاد کو سلامت رکھے اور فائز المرام کرے۔ آمین ثُم آمین۔

مولوی رحیم الدین شاہ صاحب اور مولانا ابوالخیر

(۱۴)

دونوں تصوّف کے رُکنِ رکین۔ برگزیدہ اسلاف کے جانشین حضرت مظہرِ جانِ جاناں رحمت اللہ علیہ کے خوشہ چیں۔ ایک مُرید دوسرے نبیرۂ رشید۔ تصرّفاتِ باطنی کے ازیادرفتہ خواب کی تعبیر۔ ظلماتِ دہر میں لمعۂ نور۔ گئے گزرے زمانہ میں شمعِ طور۔ کل تک آنکھوں کے سامنے تھے۔ آج اوجھل ہو گئے۔ ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ پیش ہے۔ قلمِ سعادت رقم گلچینِ برکات ہے۔

مولوی رحیم الدین شاہ صاحب۔ والدِ مرحوم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ماموں کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ دادی صاحبہ کا ان سے پردہ نہیں۔ معلوم نہیں رشتہ کیا ہے۔ قریبی ضرور ہے۔ ورنہ یہ سلوک روانہ ہوتا۔ جب حیدرآباد سے آنا ہوتا ہے۔ والد کے ہمراہ خدمتِ اقدس میں حاضری لازمی۔ آنجناب گاہے گاہے غریب خانہ کو اپنے قدموں سے منوّر فرماتے ہیں۔ یہ سرسری قدم بوسیاں ہیں۔

اصل تعلقات والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد قائم ہوئے۔

شکل وشمائل:۔

فریضۂ جمعہ ادا کرنے جامع مسجد جا رہے ہیں۔ خانقاہ شریف کے مقابل سکونت ہے۔ مٹیا محل کے بازار سے گزرنا لابد۔ کشیدہ قامت رنگ دانۂ انار۔ یہ جوانی کا رنگ روپ ہے۔ کشادہ پیشانی۔ کتابی چہرہ۔ بھری ہوئی ڈاڑھی۔ قد نہ دراز نہ کوتاہ۔ قدرے متبدّن ہیں۔ سر پر کھڑکی دار سفید دستار۔ پیراہن گھٹنوں سے نیچا۔ ہاتھ میں سفید بینی پاک۔ نفاست کی تصویر۔ رُوحانیّت کا مجسّمہ۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ مولوی رحیم الدین شاہ صاحب ہیں۔

روز کا ان کے ہاں آنا جانا۔ خانقاہ شریف کے سامنے سے گزرنا۔ پھاٹک میں سرراہ مولانا ابوالخیر کی نشست۔ آداب بجا لائے۔ آنکھیں نیچی کیں آگے بڑھ گئے۔ اب تک اِس ذاتِ ستودہ صفات سے تعارف نہیں ہے۔ چچا صاحب (نوّاب ننّھے خانصاحب) ان کے خاص الخاص آدمیوں میں ہیں۔ تمام کاروبار میں دخیل۔ ہر مشورہ میں شامل۔ آج مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے تو ان کی معرفت کل تسبیح خانہ کی عمارت بن رہی ہے تو ان کی طرف سے مدد لگی ہوئی ہے۔ سنگِ مرمر کے مُجّمر اور قبُور کے تعویذ ان کی کاردانی کے شاہد ہیں۔ شادی شد کا موقع ہے تو یہ سربراہ کار ہیں۔ مگر خادم (یعنی مُرید) نہیں۔ پیری مُریدی کے تعلقات نہیں دوستانہ روابط ہیں۔

ہم بے پیر کسی کو پیر بنانے والے نہیں۔ والدِ مرحوم ان کے خزانچی ہیں کبھی باریاب نہیں ہوتے۔ عبدالحکیم جفت فروش خادمِ آنجناب روپیہ لاتے ہیں رکھوا جاتے ہیں۔ آتے ہیں لے جاتے ہیں۔ انکو حضرت صاحب سے رغبت نہیں۔ ان کی فطرتی بزرگانہ ادائیں خلافِ طبیعت تھیں۔ خدمتِ عالی میں باریابی ہوئی مگر مرکر۔ حضور کے حکم سے جنازہ گیا۔ خانقاہ شریف کے صحن میں بہ نفسِ نفیس نمازِ جنازہ پڑھائی دعائے مغفرت کی۔

آج پہلی مرتبہ اس احقر نے یہاں قدم رکھا ہے۔ عرض کر چکا ہوں دَر پر سے گزر ہوتا رہتا۔ اور جمالِ جہاں آرا سے آنکھیں روشن کر لیا کرتا۔

اب اصل ذکر سُنیئے۔ مولوی رحیم الدین شاہ صاحب کے گھر کا حال دیکھئے۔ ہمہ وقت چائے تیار ہے۔ پتیلا چولھے پر چڑھا ہوا ہے۔ جو حاضر ہوتا ہے دستِ مبارک سے پیالی عطا ہوتی ہے۔ یہ کشمیری چائے ہے۔ قدرے نمک کی آمیزش ہے۔ پھر ایسی چائے پینی نصیب نہیں ہوئی۔ خدا معلوم ہاتھ کی برکت تھی یا چائے کی خوبی۔ مگر ہمارے ساتھ خصوصیت ہے۔ چائے میں تو سب کا ساجھا ہے ہم تو ان کے مال میں بھی شریک ہیں۔ دہلی کے پنجابی تاجر اور میرٹھ کے بُوچڑ ان کے معتقد ہیں۔ متمول ہیں۔ خوش عقیدہ ہیں۔

طرح طرح سے تحائف گزرانتے ہیں۔ یہ سب ہر پھر کے ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔ اس میں پھل پھلاری۔ مٹھائی سب ہی کچھ شامل ہے یہ تو نوکر لاکر گھر بیٹھے پہنچا جاتے ہیں۔ خود حاضر ہوتے ہیں تو چینی کے بیش قیمت ظروف عطا ہوتے ہیں۔ اونی بنیان دیئے جاتے ہیں۔ جرابیں ملتی ہیں۔ تولیہ بخشش ہوتے ہیں۔ غرض خالی ہاتھ گھر آنے نہیں دیتے۔ کچھ نہیں تو چار چھوارے ہی رومال میں بندھوا دیتے ہیں۔ خدا مغفرت کرے۔ دل سے دعا نکلتی ہے۔ اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ اب یہ محبّتیں کہاں گئیں۔ وہ وضعداریاں کدھر رخصت ہوئیں۔

ایک مزے کی بات سُنئے۔ جب نوکر کچھ لاتا۔ ہم اپنی مقدرت کے موافق دو چار آنے اُس کی نذر کر دیتے۔ وہ جاکر عرض کر دیتا۔ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب بندہ کے چچا کے حضور سے بحید روابط ان کے مرنے کے بعد علام محمد حسن خاں ان کے صاجزادے کے پاس حصّہ بھیجا۔ وہاں سے نوکر خالی ہاتھ آیا۔ سو کھا ٹرخا دیا۔ اُس نے شکایت کی۔ حصّہ بھیجنا موقوف۔ مجھ سے بھی اس کا ذکر کیا۔ ہمیں کان ہو گئے۔ ابھی تک ان کے دونوں ملازم فیروزی اور مشتاق مہینہ کے مہینہ آتے ہیں اور ان کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔ تصرّفاتِ باطنی چشم دید عرض کرتا ہوں۔ سر میں بارہا شدید درد ہوا۔ وہاں

گئے جھاڑ دیا جاتا رہا۔ ایک دن ان کا ملازم مشتاق میری موجودگی میں حاضر ہوا۔ نمونیا میں مبتلا۔ سینہ میں سخت درد۔ کچھ پڑھ کر دم کر دیا نمونیا رہا نہ درد۔ جس بات کا خیال کر کے گئے۔ حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے۔ باتوں باتوں میں اس کا جوابِ شافی پالیا۔ اور بھی لوگوں سے سابقہ پڑا۔ یہ اپنے کو صاحبِ باطن ظاہر فرماتے تھے۔ مکّار تھے اور مزوّر۔ نوّاب ابوالحسن خاں صاحب میرے چچازاد بھائی اور نوّاب ننھے خاں صاحب ان کے پھندوں میں پھنسے۔ خوب دعوتیں اڑائیں مہماں نوازیاں ہوئیں۔ مہینوں ان کے ہاں رہے۔ قوالیاں سنیں۔ حال کھیلے۔ روپے ہتیائے۔ مگر ہم پر ان کا داؤں نہ چلا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارے۔ طرح طرح کے ڈھونگ رچائے۔ ہمارے کان پر جوں نہیں چلی۔ جو مال و زر کا طالب ہو وہ کیا خاک صاحبِ باطن۔ ہم تو یہ جانتے ہیں جو ہم کو دے یا دلوائے وہ ہمارے لیکھے ولی باقی سب للی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ انہوں نے نوّاب ننھے خاں صاحب کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کرائی۔ سُنئے یہ کیونکر۔ گاڑی میں بٹھا لال قلعہ کے نیچے لے جا کھڑا کر دیا۔ اُدھر سے روزانہ شام کے وقت گھسیارے گزرتے ہیں۔ یہ کہہ دیا کہ سر پر گٹھا لے کر ایک

گھسیارہ گذرے گا۔ وہ حضرت خضر ہیں۔ بات نہ کرنا۔ دور سے درشن کرلینا۔ ایسا ہی ہوا۔ ان کو یقین آگیا۔ کیا خوب خضر کے دیدار ہوئے۔

ایک اور بات مولوی رحیم الدین شاہ صاحب کی قابلِ ذکر ہے۔ جمعہ کے جمعہ سہ پہر کو ایک وسیع میدان میں تشریف فرما ہوتے۔ آگے پیسوں کا ڈھیر مونڈھے پر رکھا ہوتا۔ سارے محلّہ کے لڑکے جمع کئے جاتے۔ جو لڑکا درود شریف پڑھ کر سُناتا۔ پیسہ یا دو پیسہ ملتے۔ اس طرح ہزاروں کو درودِ پاک یاد ہو گیا۔ مہینہ کے مہینہ دھڑیوں لڈّو بنتے۔ سب کو تقسیم ہوتے ہمارا حصّہ گھر بیٹھے آجاتا۔ دو چار نہیں سیروں آخر ہم تو خواص میں تھے۔

اب مولانا ابوالخیر کا ذکر سُنئے۔

ہمارا ان کا ربط ضبط نہیں۔ باوا بے شک ان کے خازن۔ باوا کا انتقال ہوا۔ ہم نے عرض کرایا۔ حضور روپیہ لے لیں۔ ہم میں حساب کتاب رکھنے کی لیاقت نہیں۔ جواب ملا۔ رفتہ رفتہ لیں گے پھر عرض کرایا۔ تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں۔ ہر مد کا روپیہ تمام و کمال لیا جائے۔ حساب رکھا نہیں جائے گا۔ مدیں بہت سی۔ تسبیح خانہ کی مد مسجد کی مد۔ قبرستان کی مد۔ عرض مقبول ہوئی۔ برس چھ مہینہ

میں ساری رقم ادا ہو گئی۔ اسی عرصہ میں چچا صاحب (نواب ننھے خاں صاحب) مرض فالج میں مبتلا ہو کر راہئ ملکِ بقا ہوئے۔ آچا موئی آچا کی جائے مجھ کو ہوئی۔ یہ ان کے مشیرِ کار۔ اب ہم مشیرِ کار قرار پائے۔ ہم خود کبھی حاضر نہیں ہوتے۔ طلبی ہوتی ہے۔ خان آتا ہے فوراً اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اطلاع کا طریقہ نرالا۔ باہر کھڑے ہیں۔ خانوں نے بسم اللہ بسم اللہ بآوازِ بلند کہنا شروع کیا۔ اجازتِ باریابی ہوئی۔ ہم اندر بڑھے۔ دو خان منکر و نکیر کی طرح دونوں جانب ساتھ ہیں۔ ہر قدم پر بسم اللہ کا وِرد ہے۔ جب حاضر ہوتے ہیں سبز چائے کی تواضع ہوتی ہے۔ پان پتہ کچھ نہیں۔ جو حکم ہوا انجام دیا۔ اکثر انگریزی میں تار یا چٹھی لکھوائی جاتی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ دوپہر کا وقت ہے یاد ہوئی۔ حضور پھاٹک میں بر آمد ہیں۔ ارشاد ہوا۔ ہمارا خیال صاحب زادے (مولانا بلال) کو انگریزی پڑھوانے کا ہے۔ تو کیا کہنا ہے نیچی آنکھیں کر کے دست بستہ دبی زبان سے کہا۔ غلام کے نزدیک مناسب نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ علومِ دین کی تعلیم ہونی چاہئے۔ دنیا اور دین کی فلاح اسی میں ہے۔ محنت برداشت کی اور سیکھی بھی تو حد سے حد انٹرنس تک۔ اس سے کیا بنتا ہے۔ ہماری رائے قابلِ قبول

نہ تھی۔ تسبیح خانہ میز کرسی سے آراستہ کیا گیا۔ تاکہ انگریزی کا ماحول درست ہو۔ ماسٹر نوکر ہوا درس شروع ہوا۔ چند روز جاری رہا۔ پھر موقوف۔ ہمیں دریافت کرنے کی جرأت کہاں۔ خود ہی اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ ہم نے انگریزی تعلیم بند کردی۔ ڈاکٹر انصاری آئے تھے۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ کہا صاحبزادہ کے دماغ میں انگریزی حاصل کرنے کی طاقت نہیں بندہ بجا ارشاد ہوا کہکر چپ ہو رہا۔

ایک اور واقعہ سُنئے۔ اس سے حضور کے بھولے پن کا ثبوت ملتا ہے۔ واقعی جنّتی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اکثر صلاح مشورہ کے لئے عبدالحکیم حُقّہ فروش آتے اور پوچھ کر چلے جاتے۔ طلبی نہیں ہوتی۔

صبح کا وقت ہے۔ ابھی سو کر اُٹھا ہوں۔ حضرت صاحب کے پاس سے عبدالحکیم آئے ہیں نشست کے کمرہ میں گیا۔ دیکھا پریشان ہیں۔ کہنے لگے صاحبزادی صاحبہ فرار ہوگئیں۔ ابھی بُلایا ہے۔ پاؤں کے تلے کی زمین ہی تو نکل گئی۔ کیسا خاندان اور کیا حادثہ۔ بھائی یہ کیا ہوا۔ کِس کے ساتھ چلی گئیں۔ کہنے لگے اپنے شوہر کے ساتھ۔ میں نے کہا کیا خوب اور ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ چلو غصّہ ہیں

بھرے بیٹھے ہیں۔ اُن کو سمجھاؤ۔ کہتے ہیں پولیس جا کر رپٹ لکھواؤ۔
افسردہ صورت بنا کر پہنچے۔ آج بھی پھاٹک ہی میں نشست ہے
نظریں نیچی کر کے جا بیٹھے۔ فرمایا تجھ کو خبر ہے۔ رات کو صاحبزادی
صاحبہ فرار ہوگئیں۔ عرض کی یہ واقعہ کیسے ہوا۔ کس کے ساتھ
تشریف لے گئیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ ہماری بلا اجازت۔ عرض کی تو
حضور یوں فرمائیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ تشریف لے گئیں۔ فرار ہونا
کیسا۔ سخت غیض و غضب کے لہجہ میں ارشاد ہوا۔ ہماری بلا
اجازت۔ عرض کی حضور کی اجازت تو اُسی دن ہوگئی جس دن عقد ہوا
فرمایا۔ واقعہ کی رپٹ کوتوالی میں درج کرانی چاہئے۔ اِس لئے تجھے
بلایا ہے۔ میں نے کہا کیا فائدہ۔ پولیس کیا کر سکتی ہے۔ فرمایا تو ہم کچھ
کر ہی نہیں سکتے۔ ہمّت باندھ کے بولا۔ حضور قانون ایسا ہی ہے۔ تو
کیا ہماری اجازت کی ضرورت نہیں۔ حضور بالکل نہیں۔ فرمایا اب
ہم اُس کی صورت عمر بھر نہیں دیکھیں گے۔ عرض کی حضور مختار ہیں
چند کلمے تشفّی آمیز کہہ کر رخصت ہوا۔

خدائے تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔ کیا لوگ تھے۔

میں صاحبِ باطن نہیں جو فیوضِ باطنی کے بارہ میں کچھ لکھ
سکوں۔ ہاں اتنا بارہا دیکھا ہے۔ سڑک پر دیوار سے لگے ہوئے

ٹکڑے سہمے بلبیوں خان پیل تن شیر دل کھڑے ہیں اور ڈاڑہیں مار مار کر رو رہے ہیں - دریافت پر معلوم ہوا - اندر سے توجّہ دی جارہی ہے - بہ کچھ کم تصرّف ہے - یہ سب بے داموں کے نوکر ہیں - جو حکم ہوتا ہے بجالاتے ہیں - جان تک سے دریغ نہیں - ادنیٰ سے ادنیٰ کام اپنی سعادت اور درستئ عاقبت کا وسیلہ خیال کرتے ہیں شمع رُو پر پروانہ وار نثار ہوتے ہیں - یہ سب چشم دید ہے - یہ جاہلِ مطلق اس چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوئے اور ہم بدنصیب موقع ملا اور محروم رہے - اپنی اپنی قسمت ہے -

این سعادت بزورِ بازو نیست

میاں صاحب مولانا نذیر حسین محدثؒ

(۱۵)

مولوی محمد نقی خان ۔ میرے دادا ۔ علم و فضل میں لگانہ روزگار ۔ منطق اور فلسفہ کے فاضل اجل ۔ بدمزاج ایسے کہ چلتی ہوا سے لڑیں ۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں ۔ چیل گڑھ (یعنی بالاخانہ) پر تشریف فرما رہتے ہیں ۔ یہ ہیں اور ان کی کتابیں ۔ بھلا شاگردی کی کون تاب لائے ۔ علم کے شوقین بُرے ہوتے ہیں ۔ اب کا زمانہ تھوڑی ہے کہ علم ٹکڑوں کی خاطر حاصل کیا جاتا ہے ۔ کسی طرح اناپ شناب امتحان پاس کرلو ۔ کچھ آئے یا نہ آئے روٹی کے حیلے سے تو لگ ہی جاؤ گے ۔ پہلے زمانہ میں علم کے شیدائی پیدا ہوتے تھے اس راستہ کی ساری کڑیاں جھیلتے تھے ۔ استادوں کے ناز اُٹھاتے تھے جب جاکر کچھ بنتے تھے ۔ حضرت کے ایسے ہی لوگ شاگرد ہوئے ۔ ان میں سے ایک مولانا نذیر حسین محدث ہیں منقول میں نہیں معقول میں ۔ استاد خود معقولیہ ہیں ۔ یہ میاں صاحب سے خاندانی تعلقات کی حقیقت ہے ۔

والد مرحوم حیدرآباد میں ملازم ہیں ۔ دوسرے تیسرے

سال گھر آتے ہیں۔ ہر پھیرے میں ایک مرتبہ میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا لازمی ہے ہیں۔ کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے خود میاں صاحب کبھی ہمارے گھر پر تشریف نہیں لائے۔ شاید سِن کا تقاضا ہو۔ اس زمانہ کے لوگ ایسے نہ تھے۔ باز دید فرض خیال کی جاتی تھی۔ استادزادوں کا بے حد لحاظ تھا۔ انکی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے۔

اب میاں صاحب کی زیارت ہونے کا قصّہ سُنئے۔

میری شادی کا وقت آگیا۔ گھر ہی کا دُولھا گھر ہی کی دُلھن۔ ایک بھائی کا بیٹا۔ دوسرے کی بیٹی۔ عقدِ نکاح کے لئے مفتی صدرالدین صدرِ صدور دہلی کی حویلی قرار پائی۔ یہ بھی بھائی کا مکان۔ دونوں بھائیوں کو اُس پر برابر کا حق حاصل۔ ہم اکلوتے بیٹے۔ نوّاب امام بخش خان کے خاندان کے چشم و چراغ۔ ہمارے سوا کوئی اولادِ نرینہ نہیں شادی میں جو دھوم دھام ہو تھوڑی ہے۔ مٹیا محل کے پھاٹک پر نوبت رکھی گئی۔ یہ ہماری ماں کا ارمان تھا۔ محافل کا ارادہ نہ تھا طُورہ بندی کی تجویز تھی۔ مگر بیاہ بیچ پچھے۔ پنڈل بھاری معلوم ہوئی۔ نوّاب غلام مُحمّد حسن خان۔ نوّاب فیض احمد خان۔ میر جمال الدین سب کے سب نو عمر۔ وفد بناکر باوا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

محافل کی درخواست کی ۔ پزیرا ہوئی ۔ اُسی شب سے قرار پا گئیں۔ یہ تین راتوں لگاتار ہوں گی ۔ اِس کے بعد نکاح کی تاریخ آجائے گی۔
شامیانے تن گئے حویلی صدرالصدور آراستہ تھی ہی اور آراستہ ہو گئی۔ صحن چبوترے کے آگے تخت لگا کر نہر تک وسیع کر دیا۔ طوائف کو بمعیانہ نقیب لے کر روانہ ہوئے۔ بھانڈوں کی چوکیوں کو کہلا بھیجا سارے شہر کے معزّزین مدعو ہوئے ۔ اُکل و شُرب کا انتظام ہوا سردی کڑاکے کی پڑ رہی ہے ۔ کچھ مہاوٹ کے بھی آثار ہیں ۔ رات بھر کشمیری چائے کا دَور ہوگا۔
ایک واقعہ قابلِ عرض ہے ۔ شام کا وقت ہے ۔ ابھی مغرب کی اذان نہیں ہوئی۔ بعد نمازِ عشاء محفل شروع ہوگی۔ خواندہ اور ناخواندہ سارے مہمان جمع ہوں گے ۔ عام محفل ہے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔
نوّاب کرم اللہ خان عرف ننھّے خان اور احسان الرحمٰن خان سرگرمِ اہتمام ہیں۔ ہمارے باوا تو بس روپیہ دیدیں گے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے تو درکنار زبان بھی نہیں ہلائیں گے ۔ تیار کام پر آن موجود ہوں گے ۔ پھر رات بھر موجود رہیں گے ۔ نہ کسی کی خاطر کریں گے نہ مدارات یہ سب دوسروں کے سپرد ہے۔
سامنے سے ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ابھی تک بقیدِ

حیات ہیں۔ اللہ سلامت رکھے۔ بڑے خاندانی۔ بڑے ممتاز و مُرتاض۔ تقدّس ان کے لئے امرِ لازمی۔ ذرا بھی اس میں فرق آجائے تو کام بگڑ جائے۔ روٹیوں کے لالے پڑ جائیں۔ جوان ہیں۔ کان سرود کے جویا۔ آنکھیں رقص کی طالب۔ دل نازنینانِ مہوش پر لوٹ پوٹ۔ ایسے رقص و سرود کے موقع کب ہاتھ آتے ہیں۔ اپنے ہی گھر کی محفل ہے۔ نواب ننّھے خاں صاحب نے اُن کو دُور سے آتے دیکھ لیا پاس بُلایا اور کہا۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ سارا تقدّس کِرکِرا ہو جائیگا۔ شہر میں مُنھ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ مگر یہ کب ماننے والے تھے۔ غلام محمد حسن خاں کے بڑے دوست ہیں۔ عرض کی ابھی چلا جاتا ہوں۔ ذرا محمد حسن خاں سے دو باتیں کر لوں۔ محمد حسن خان ان کو لے کوٹھے پر چلے گئے۔ کوٹھری میں بند کر اوپر سے تالا جڑ دیا۔ یہاں سے ساری سیر نظر آتی ہے۔ یہ سب کو دیکھ سکتے ہیں اور کوئی ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ ستم یہ ہوا کہ بند کر کے بھُول گئے۔ آواز نکالنے کا یارا نہیں۔ قلعی کھُلی جاتی ہے۔ ساری رات جاڑے میں پڑے ٹکے گِنا کئے۔ نیچے گرم گرم چائے کے دَور چل رہے ہیں۔ یہ بوند پانی کو ترس رہے ہیں۔ سردی کا کوئی سامان پاس نہیں۔ اکڑے جاتے ہیں۔ مگر سیر تو دیکھ رہے ہیں۔ مجبور کوٹھڑی کی فرشی دری میں لپٹ گئے۔ جوں توں رات

گزاری۔ صبح کو یاد آیا۔ قفل کھولا تو سکڑے سہمے برآمد ہوئے۔ رات کو
خبر نہ لینے کی شکایت کی اور فرمانے لگے میرا تو Cold beef بن گیا
یہ ان ہی کے الفاظ ہیں۔ پھر آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہ سماں تو اتر تین
رات تک رہا۔ دولہا میاں ناچ گانے کے رسیا۔ برابر ڈٹے اور
گلبانگِ طرب سے محظوظ ہوتے رہے۔

آج محفل کی آخری رات ہے۔ علی الصباح نکاح بندھے گا۔
اندھیرے منھ سے طوائف کو نکالا ملا۔ دیکھو ان کا کہیں اثر باقی نہ
رہ جائے۔ میاں صاحب تشریف لائیں گے۔ کوئی چیز خلافِ تقدس
نظر نہ پڑے۔ حقّے بھی اٹھا دیے گئے۔ شاید یہ بھی منافیٔ تقدس ہوں۔
ہم کو دولہا بنا مسند پر لیجا بٹھایا۔ سارے مہمان آ گئے۔ دونوں
دالان کھچا کھچ بھر گئے۔ چبوترے تک آدمی ہی آدمی تھا۔ میاں
صاحب تشریف لاتے ہیں۔ ڈولی میں سوار ہیں۔ کہار ڈولی لبِ مسند
تک لائے۔ دو آدمیوں نے پکڑ کر اتارا۔ خمیدہ پُشت نہیں بلکہ
زمیں دوز ہیں۔ ان کی تصویر کہیں نہیں ہوگی۔ یہ تصویر کیوں کھچوانے
لگے تھے۔ وہ تو حرام ہے۔ یہ اہلِ حدیث کے پیر۔ ایسی حرکت کیسے صادر
ہو سکتی۔ اِس لئے حُلیہ لکھنا لازم ہوا۔
بلند قامت۔ آنکھیں اندر کو دھسی ہوئیں۔ چمکدار۔ ذہانت کی

نشانی۔ رنگ چمپئی روشن۔ تدھم پڑ گیا ہے ۔ اب بھی جھلک دیتا ہے
جوانی میں قابلِ دید ہو گا ۔ ہڈیوں کی مالا ہیں۔ کبھی چھریرا بدن تھا۔
نقشہ کھڑا کھڑا۔ عربی خد و خال کا شُبہ ہوتا ہے۔ اگرچہ عرب نہیں۔
پہلی مرتبہ اور آخیر مرتبہ بس ابھی دیکھا۔ پھر دیکھنا نصیب
نہیں ہوا۔ میرے سامنے مسند پر تشریف فرما ہوئے خطبہ نہایت
فصاحت سے عربی لہجہ میں پڑھا۔ ایجاب و قبول کا وقت آیا میں نے
آہستہ سے عرض کیا ۔ مجھے قبول ہے۔ خان بہادر ڈپٹی اکرام اللہ خاں
میرے پاس بیٹھے ہیں۔ یہ والدِ مرحوم کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں
اور رشتہ دار بھی۔ مجھے چھیڑنا چاہا۔ فرمایا آواز سے کہو چار سُن سکیں
میں نے خاصی آواز سے کہا تھا۔ مجھے ناگوار ہوا۔ میری نظروں میں
ان کی وقعت نہ تھی ۔ یہ بڑھاپے تک لااُبالی تھے۔ دوبارہ جو میں نے
کہا تو ایسی بلند آواز میں کہ ساری محفل گونج اُٹھی۔ غلام محمد حسن خان
میرے برابر میں تھے انہوں نے ٹھوکا۔ میں نے ان کی طرف مُڑ کر اور
ترش ہو نواب صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ کہتے ہیں کہ زور
سے کہو۔ میاں صاحب نے بُری بُری نظروں سے ڈپٹی صاحب کی
طرف دیکھا۔ گویا اُن کی توہین کی جاتی ہے۔ میرے دل میں ان کا
ادب تھا۔ سہ بارہ جو میں نے کہا تو معمولی آواز سے بھی کچھ دھیمی

آواز ہیں۔

میاں صاحب کو تکلیف دینے کی وجہ صرف خیر و برکت تھی۔ واقعی خیر و برکت ہوئی۔ جوڑا گھس پھس کے اُترا۔ مگر پوری نہیں۔ آخر کو ہم رنڈوے ہو گئے۔ ہاں ایک برکت ضرور ہوئی کہ ہم نے عقدِ ثانی نہیں کیا۔ نہیں تو برکت کے نام بے برکتی ہو جاتی۔

سُنا تھا کہ میاں صاحب اُس کا نکاح نہیں پڑھایا کرتے جو دولھا خلافِ شرع لباس میں ملبوس ہو۔ اور سہرا ابھی بندھا ہوا ہو۔ ہمارا پاجامہ تک ریشمی تھا اور سہرا ابھی بندھا ہوا تھا۔ اگرچہ سر پر لپیٹ دیا تھا۔ اُن کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ شاید استادزادگی کا لحاظ فرمایا ہو۔

محفلیں برہم ہوئیں اور اہلِ محفل چل بسے
پہلے یاد آتے بہت پھر بھولے بسرے ہو گئے

(از خواجہ)
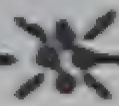
مولوی مہدی علی محسنُ الملکؒ
مولوی مشتاق حسین وقارالملکؒ

(۱۶)

یکے بعدِ دیگرے دونوں سکریٹری مدرستہُ العلوم علی گڑھ۔
پہلے انگریزی سرکار کے ملازم۔ ایک تحصیلدار دوسرے سررشتہ دار۔
پھر سرکارِ نظام کے اعلیٰ عہدے دار۔ صاحبِ حل و عقد۔

اِس زمانہ میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان صغیرِ سن ہیں۔
سرکارِ ہند نے ۔Council of Regency مقرّر کردی
ہے۔ سرسالارِ جنگِ اوّل ۔Regent سر خورشید جاہ۔
۔Co-Regent اوّل منصرمِ کار۔ دوم برائے بیت۔
انتظامِ ریاست کو نئے سانچے میں ڈھالنا مدّنظر ہے۔ شمالی ہند سے
آزمودہ کار طلب ہو رہے ہیں۔ مہدی علی اور مشتاق حسین اسی
زُمرہ میں ملازم ہوئے۔

پہلے مہدی علی کا حال سُنئے۔ ان کا عقد کُفو میں ہوا۔ ایک لڑکا
پیدا ہوا۔ پروان چڑھا۔ عین عید الفطر کے دن۔ عالمِ شباب میں۔

راہئ ملکِ بقا ہوا۔ مدت العمر عید سوگ کا دن قرار پایا۔ ماں اس صدمہ سے پاگل ہو گئی۔ بیٹے کی قبر پر جا بیٹھی۔ روتے روتے مر گئی۔ انہوں نے میرٹھ میں عقدِ ثانی کیا۔ اب ہمارے تعلقات کا حال سُنئے۔ والد کی ملازمت کا باعث مولوی عنایت الرحمٰن خاں ہوئے۔ ترقیاں مہدی علی نے دلائیں اُن کے معتبر تھے۔ ان پر اُن کے تبختر انہ الطاف تھے۔ مساوات کا سلوک نہ تھا۔ یہی ہم نے دیکھا۔ ہمارا مکان ان کی کوٹھی قریب قریب۔ روزمرہ کا آنا جانا۔ مولوی صاحب نے کبھی سیدھے مُنھ بات تک بھی نہیں کی۔ دوچار ہوئے ادب سے آداب بجالائے انہوں نے مکھی سی اڑا دی۔ شاید بچّوں سے رغبت نہ ہوگی۔ ہاں بیگم صاحبہ محبّت فرماتی ہیں۔ جب جاتے انگریزی مٹھائیاں دیتیں۔ پیار کرتیں۔ میاں بیوی دونوں کا سونا جاگنا۔ اُٹھنا بیٹھنا سب فیشن کا۔ دونوں انگریزی سے نابلد۔ بیگم صاحب خلا و ملا میں میم صاحب بنی رہتی ہیں۔ ساڑی بند نہیں۔ گون سایہ پوش۔ کرسی نشین مگر پردہ نشین۔ گاڑی پر بھی باہر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ نوکروں سے پردہ نہیں۔ مرد ہر وقت چھاتی پر سوار۔ ملنے جلنے کو کوئی نہیں آتا۔

بیوی کو ناول کا شوق ہے۔ جب دیکھو کچھ سُن رہی ہیں۔ میاں سخی نہیں۔ لکھ لُٹ ہیں۔ آئے دن ڈنر ہوتے ہیں۔ بادا اُبلائے

نہیں جاتے - وہ اس مرتبہ کے نہیں۔ بیگم صاحب کا آدمی آتا ہے۔ ہم کو ساتھ لے جاتا ہے۔ پانی کی برف بہت گراں ہے۔ روپیہ آٹھ آنے سیر ملتی ہے۔ وہ بھی دقت پر اور مشکل سے - ان کے ہاں سلّیاں کی سلّیاں آتی ہیں۔ بس ہمارے شوق کی چیز یہی ہے۔

pantry میں دروازہ کے پاس۔ مہمانوں کی آنکھوں سے اوجھل ۔کرسی رکھ دی جاتی ہے ہم چڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں مگر کھانے کچھ نہیں - ادھر برف ٹوٹی قابوں میں لگ کر چلی - راستہ میں سے ہم نے ڈلیاں اُچک لیں۔ چبانی شروع کر دیں۔ خانساماں ہنستے ہیں - ہم کرسی پر کھڑے کھڑے ٹھکلد کتے ہیں - اندر سے بیگم صاحب دیکھ رہی ہیں۔ ان کو یہ تماشا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہی علّت ہماری طلبی کی ہے۔ عمر بڑھ گئی۔ جانا آنا چھوٹ گیا۔ محسن الملک کا حیدر آباد سے اخراج ہو گیا۔ کیوں ہوا۔ خدا معلوم۔ ہندوستان آ گئے۔ مدرسۃ العلوم کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔ ہم بھی دہلی آن رہے۔ بار بار دہلی کے پھیرے مارتے ہیں۔ منشی ذکاء اللہ کے مہمان ہوتے ہیں۔ باوا کے پاس جوڑی گاڑی ہے وہ اُن کی سواری میں رہتی ہے - باوا دن میں دو دو مرتبہ حاضر ہوتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں جاتے - اس عرصہ میں ہم نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ مہدی علی آئے ہوئے ہیں۔ باوا کا حکم ہوا

اُن سے جاکر ملو۔ منشی صاحب کے گھر پر گئے۔ یہ عنایت اللہ منشی صاحب کے صاحب زادے کی کوٹھی ہے۔ منشی صاحب موجود ہیں مہدی علی نے مجھے پہچانا نہیں۔ دیکھے ہوئے مدّت ہو گئی تھی۔ منشی صاحب نے بتایا۔ اور اِس عنوان سے بڑا ذہین لڑکا ہے۔ میں نے اس کے بی۔ اے کے پرچے دیکھے ہیں۔ فارسی تیسرے درجہ کے مصنّفوں کی سی لکھتا ہے۔ ان کے کان پر جُوں نہیں چلی۔ کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ غُٹر غُٹر بیٹھے سُنا کئے۔ ہمیں ناگوارہ ہوتا۔ مگر باوا پر انکے احسان مانع تھے۔ یہ ہمارے مکان پر تو بھلا کیسے آتے۔ ہم ان کے پلّہ کے کب۔ ہمارے باوا تو مثل ان کے ادنیٰ ملازم کے تھے۔ ترکِ ملازمت کے بعد بھی وہی سلوک مرعی رہا۔ ایک دن باہر سے آکر ملازم نے کہا۔ مولوی مہدی علی صاحب باہر کھڑے ہیں۔ آپ کو بلاتے ہیں۔ وہ فوراً باہر نکل آئے۔ ہم بھی پیچھے پیچھے دروازہ میں آ گئے۔ دیکھا گلی میں کھڑے ہیں۔ ہمارے ہاں نہیں آئے تھے۔ ہمارے چچا نواب ننھے خاں صاحب سے ملنے آئے تھے۔ اُن کو اپنے برابر کا آدمی تصوّر کرتے تھے۔ راستہ میں ہمارا گھر پڑتا تھا معلوم نہیں کیوں ٹھٹک گئے۔ یہ آخری دیدار ہے۔ پھر مر گئے۔

اِس وقت کا حُلیہ بیان کرتا ہوں۔ سفید فلالین کا کوٹ پتلون

زیب تن ہے - سر پر تُرکی ٹوپی - کوٹ کا گلا بند - یہی اِس زمانہ کا فیشن تھا - رنگ گورا ہے مگر زردی کی جھلک مارتی ہے - ایک کلّے پر اچھّا بڑا بھورے رنگ کا مسّہ - میانہ قامت - بھرا ہوا بدن سفید گھنی ڈاڑھی - سفید سر - برشی مال - نقشہ موٹا موٹا - ناک آگے سے موٹی نتھنے فراخ - کشادہ پیشانی - بڑی نورانی شکل ہے -

اب تک مَیں نے سماعی واقعات لکھنے سے پرہیز کیا ہے - یہاں ایک واقعہ لکھنے پر مجبور ہوں - یہ مَیں نے باوا کی زبانی سُنا ہے - نہ لکھوں تو ان کے اخلاقِ حمیدہ کا پتا نہیں چل سکتا - نہ بھی لکھتا - مگر ان کی سوانح عمری میری نظر میں کوئی نہیں لکھی گئی - ایسی صورت میں دنیا کو اُن کی خوبیوں سے بے خبر رکھنا مناسب نہیں - ان کے احسان لوگوں پر اتنے تھے - بیس سوانح عمریاں بھی لکھی جائیں تو بھی کم تھیں - دنیا احسان فراموش ہوتی ہے - اس مردِ خدا نے ہزاروں آدمیوں کو روٹی سے لگا دیا - بہت سے خاندان بنا دیئے - جتنے شمالی ہند کے آدمی حیدر آباد میں ملازم تھے - کم سے کم آدھے اسی چشمہ فیض سے فیضیاب ہوتے تھے -

اب اصل واقعہ سُنئے - یہ جس زمانہ میں سرکارِ انگریزی میں تحصیلدار تھے - اس وقت بھی بے دریغ خرچ کرنا ان کا شیوہ تھا

تحصیل کا خزانہ ان کے سپرد۔ سرکاری روپیہ خرچ کر دینے سے بھی باک نہیں۔ پھر بھر دیتے تھے۔ چار ہزار روپیہ خزانہ سے نکال لیا تھا۔ ایک صاحب ان کے اہلِ مد تھے۔ اُن کو پتا چل گیا۔ چار ہزار خزانہ سے اُڑا ہوا ہے۔ کسی پاس ہی کے مقام پر کلکٹر صاحب دورہ پر تھے۔ اطلاع کر دی۔ خبر دار نے ان کو بھی خبر کی۔ معلوم ہوا کہ علی الصباح کلکٹر اچانک آجائے گا۔ آتے ہی خزانہ کا جائزہ لے گا۔ بابو گیا پرشاد ام۔ اے کے والد وہاں ساہوکار تھے۔ روپیہ اُن سے منگوا کر راتوں رات داخلِ خزانہ کر دیا۔ صبح کلکٹر صاحب آئے تو رقم پوری پائی۔ یہ بھی پتا لگ گیا کہ اطلاع کرنے والے حضرت کون تھے۔ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ اسی عرصہ میں حیدرآباد چلے آئے۔

والد ان کے ساتھ کام میں مصروف ہیں۔ سامنے سے جلتی دوپہر میں ایک صاحب آتے نظر آئے۔ مہدی علی نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور پہچان گئے۔ نوکر نے اطلاع کی۔ ٹھہر جانے کو فرمایا۔ اُن کا سارا قصہ والدِ مرحوم کے سامنے بیان کیا۔ پھر اُن کو بُلا لیا۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ رشوت ستانی کے جرم میں خدمت سے علیٰحدہ کر دئے گئے ہیں۔ اب فاقہ کی نوبت ہے۔ مع اہل وعیال کے

حیدر آباد چلے آئے ہیں۔ یہ سنکر اس اللہ کے بندے نے پہلے تو یہ کہا۔ مولوی صاحب آپ کو یاد ہے آپ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں تو بال بال ہی بچ گیا۔ وہ شرمندہ ہو گئے اور بہ عرق عرق۔ آنکھیں نیچی کرلیں۔ پھر آنکھ ملاکر اُن کی طرف نہیں دیکھا دلاسا دیا اور بہت جلد نوکری دلانے کا وعدہ کیا۔ اور وعدہ کا ایفا بھی جب وہ رخصت ہو گئے تو والد سے کہا۔ مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ ایسی بات میرے مُنہ سے نکل گئی۔ یہ وہ اخلاقی خوبیاں ہیں جن کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اس واقعہ نے اُن کی عزت اور احترام کا سکّہ میرے دل پر بٹھا دیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اصول مفروضہ سے علیحدہ ہو کر سماعی واقعہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

ان کے حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد بیگم صاحبہ کچھ دن وہاں رہ گئیں۔ اُن کے بہت سے عزیز و اقارب ملازم تھے۔ ایک دن بند گاڑی میں باغِ عام سے گزر رہی تھیں۔ میں نظر پڑ گیا گاڑی رکواکر مجھے بلایا۔ دو چار شفقت آمیز باتیں کیں۔ یہ آخری مرتبہ اُن کی آواز سُنی جو اَب تک کانوں میں گونج رہی ہے اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہم محبّت کے بندے ہیں جو ہم سے محبّت کرتا ہے ہم اُس کو نہیں بھولتے چاہے صدیاں گزر جائیں۔

اب مولوی مشتاق حسین کا حال سُنئے۔ ہمیں خبر نہیں کہ یہ کون ہیں اور کہاں بستے ہیں۔ کہیں کے صوبہ دار ہوں گے۔ اگر شہر میں ہوتے تو ضرور نظر پڑتے۔ سر آسمان جاہ بہادر قلمدانِ وزارت سے سرفراز ہوئے اور یہ نمودار ہوئے۔ معتمدِ مال گزاری کا عہدہ سنبھالا۔ معتمد تھوڑی تھے۔ منصرمِ امورِ ریاست تھے۔

سر آسمان جاہ نور تنیں تھے۔ پائیگاہ کے امیر تھے۔ بس سمجھ لیجئے۔ اتفاق کی بات ہے۔ ہمارے مکان سے ان کی کوٹھی کچھ دُور نہ تھی۔ مگر مہدی علی خاں کی بات کہاں۔ نہ فیشن نہ دعوتیں۔ رُوکھے پھیکے مولوی ہیں۔ مولویت کا ساتھ بورڈ جان کے ساتھ۔ سر گُھٹا ہوا۔ روز سر پر مکھن کی مالش ہوتی ہے۔ یہ ہر سیّد کے اوّلین حواری ہیں۔ لباس میں تو پتلون کو بھی نہیں بخشتے۔ سر پر تُرکی ٹوپی ہوتی ہے۔ اور سر اس پر چغلی کھاتا ہے۔ اسی زمانہ میں افسرالاطبا، ان ہی کے بنائے ہوئے حکیم احمد سعید امروہوی ہیں اپنے فن میں کامل ہیں۔ بہت ذی علم ہیں۔ مگر دستِ شفا نہیں۔ ہر نسخہ میں اکثر افسنتینِ رومی تحریر فرماتے ہیں۔ لوگ حکیم افسنتین کہنے لگے۔ ان کی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ بیٹیاں دو دو ہیں۔ ایک صاحب زادی سراج العارفین کو بیاہی ہوئی ہیں۔ یہ صاحب

گھر داماد ہیں۔ بال بچّے دار ہیں۔ پھر بھی ہمارے ساتھ مدرسہ میں
داخل ہیں۔ مگر چند روز۔ بھلا بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھتے ہیں۔
سب کے سب بڑے خاندانی اور شریف ہیں۔ ان سے ملاقات
ہوگئی اور مسلسل جاری رہی۔ روز کا آنا جانا۔ حکیم صاحب سے بھی
راہ و رسم ہوگئی۔ والدِ مرحوم کے بھی ان سے گہرے تعلقات تھے۔
کیا کہوں کیا آدمی تھے۔ محبت اور شرافت کے پُتلے۔ مجھے بہت
عزیز رکھتے تھے۔ ان کے ہاں ایک مولوی صاحب آتے ہیں۔ نام
کبھی نہیں سُنا۔ مولوی بنگالی کہلاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ان
کی آمد و رفت ہے۔ سمجھ لیجئے جو بنگالی مولویوں کی شان ہوتی ہے
وہی ان کی شان ہے۔ آدمی بڑے نیک بخت۔ نیک طینت۔
شاید عربی اچھّی جانتے ہوں گے۔ لکھنا تو بالکل نہیں جانتے۔ ہمارے
سامنے سیکھ رہے ہیں۔ آخر بُرا بھلا کچّے پکّے خط میں لکھنے لگے
یہ لکھنا آنا ان کے حق میں زہر ہوا۔ کاش نہ آتا۔ مولوی مشتاق حسین
کے دائمی مہمان ہیں۔ شاگرد پیشہ میں ایک کوٹھڑی ملی ہوئی ہے۔
اخراجات کے بھی یہی کفیل ہوتے ہیں۔ ان سے ہماری ملاقات
ہوگئی۔ کبھی کبھی آنا جانا ہوتا ہے۔ مولوی مشتاق حسین بھی نظر
پڑ جاتے ہیں۔ آداب بجا لائیے۔ بات چیت کا موقع نہیں آیا۔ ہوتی

کیونکہ اگر وہ منھ لگاتے تو ہوتی۔ سیّد احمد خانی کسی کو منھ نہیں لگایا کرتے۔ کوئی سر چڑھ کر ملے تو ملے۔ یا اُن کی کسی سے غرض اٹکی ہو تو ملیں۔ یُوں خدا واسطے کا میل جول بے وقوفی ہے اور اضاعتِ وقت۔ ہمارے مولوی بنگالی ادھیڑ آدمی تھے۔ تاہم اب تک نکاح بیاہ کی طرف توجّہ نہیں فرمائی تھی۔ اب یہ خیال آیا۔ تدبیر کی تو سُنتا ہے بچّہ کی طرح مہینوں پڑا رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں ہم مزاج پُرسی کو بار بار جاتے اور بہت ہمدردی کرتے۔ مزاج پرسی کا تو بہانا تھا۔ در اصل خاکا اڑانا تھا۔ خدا کا شکر ہے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ صاحبِ اولاد بھی ہوئے۔

رزیڈنسی کی عدالت میں ایک مقدمہ شروع ہوا۔ تفصیلی حالات خارج از موضوع ہیں مختصر سُن لیجئے۔ گرٹروڈ ڈونیلی۔ مہدی حسن فتح نواز جنگ کی زوجۂ محترمہ اس مقدمہ کی بنا۔ آغا مرزا بیگ سرور جنگ کو اُن کی تخریب مدّ نظر۔ آپس کی مخالفت کا نتیجہ۔ مولوی مشتاق حسین مہدی حسن کے طرف دار۔ دور دور سے گواہ آرہے ہیں۔ بڑھاپے میں قیصر خاں کے جوانی کے کرتوت طشت از بام ہو رہے ہیں۔ مولوی مشتاق حسین کو ایک معتبر آدمی کی ضرورت ہے جو عدالت کی دم دم کی خبریں اُن تک پہنچائے۔ سرکاری ملازم کو وہاں بھیجنا

قرینِ مصلحت نہیں۔ بنگالی مولوی کی معرفت وقار الملک کا پیغام ہمارے پاس آیا۔ ہم اس فرض کو انجام دیں۔ کمرۂ عدالت پولیس کے زیرِ انتظام۔ از سرتاپا بھرا رہتا ہے۔ ہم کو وہاں کون گھسنے دے۔ رزیڈنسی کے کوتوال کے ذریعہ سے انتظام ہوا۔ ہم بہترین مقام پر بٹھائے جانے لگے۔ روز شام کو ہماری تحریری رپورٹ پیش ہو جاتی ہے۔ اس کارگزاری کے صلہ میں مولوی مشتاق حسین نے ہمارے باوا سے کہا۔ آپ درخواست دیجئے۔ میں سرکاری خرچ پر مجید کو انگلستان بھجوا دوں گا۔ جو چاہے وہاں جاکر پڑھے۔ ہم اکلوتے۔ ماں باپ کے پیارے۔ بھلا اُن کو ہماری جدائی کیسے گوارا ہوتی۔ انکار کر دیا۔ اس مقدمہ کا ذرا سا حال سُن لیجئے۔ میم صاحب بد چلن ثابت ہو گئیں۔ مہدی حسن معتمد معدنیات اور ریلویز نے دورانِ قیامِ انگلستان میں یہ جرأت کی تھی کہ ہماری تقدس مآب ملکہ وکٹوریہ سے ان کا ہاتھ مِلوا دیا تھا۔ مہدی حسن فتح نواز جنگ بہ یک بینی و دو گوش نکال دئے گئے۔ پنشن تک ندارد۔ ہاں جُرم ہی ایسا تھا چاہ کن را چاہ در پیش۔ آغا مرزا خوب بڑھے چڑھے۔ ان کا طوطی بولا۔ پھر اخراج ہوا۔ اعلیحضرت نظام مرحوم کو ان سے خصوصیت تھی۔ شہر بدر تو ہو گئے۔ مگر داد و دہش میں کمی نہیں آئی۔ لاکھ سر مارا۔ نظام کے

دیدار کی مدّت العمر اجازت نہیں ملی۔

ہر کمالے رازوالے۔ مولوی مشتاق حسین کا بھی اخراج ہوگیا کیوں ہوا۔ قصہ طویل ہے۔ رزیڈنسی کی طرف سے ہوا۔ مولویانہ روشنی طبع کا نتیجہ تھا۔ مالک کی خیر خواہی کی تھی۔ مگر پولیسی کا دیوالہ مولویانہ عقل سرکار انگریزی کے اقتدار کو سمجھنے سے قاصر رہی ہندوستان آکر مولوی مہدی علی کے بعد مدرستہ العلوم علی گڑھ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ کام بہت خوب انجام دیا۔ ان کی لیاقت میں خامی تھوڑی تھی۔ سارے سرسیّد کے حواریوں میں سب سے زیادہ راست باز، متدین اور فہمیدہ آدمی یہی تھے۔

آخری مرتبہ ان کا دیدار دہلی میں ہوا۔ پریڈ کے میدان میں۔ ہندی زبان کی بابت جلسہ تھا۔ یہ کھڑے لکچر دے رہے تھے۔ میں چند لمحوں کو اندر داخل ہوا۔ صورت دیکھ لی۔ میرا طریقہ عام جلسوں میں جانے کا نہ تھا نہ ہے۔ اگر چلا بھی گیا تو کسی خاص ضرورت سے وہ بھی منٹ دو منٹ کے لئے۔

اب ذرا سا حال مولوی بنگالی کا سُن لیجئے۔

مولوی مشتاق حسین شہر بدر۔ مولوی بنگالی دربدر۔ مگر خدا کارساز ہے۔ اقبال الدولہ مدار المہام مقرر ہوئے مولوی بنگالی

کی سفارش ہو گئی۔ خبر نہیں کس عنوان سے۔ غالباً ولی اللہ بتایا گیا ہوگا۔
محل فلک نما پر طلبی ہوئی۔ رہنے کو کمرے عطا ہوئے۔ کھانے کو ہمہ نعمت
جیب خرچ کو رقم کثیر۔ کپڑا لتہ بھی ملتا رہتا ہے۔ اب کیا کہنا ان کے
تو گھرے ہو گئے۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ اب جو مولوی
بنگالی صاحب ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں۔ تو جوڑی گاڑی پر سوار
جامہ وار کی اچکن۔ ہمیں ان کی خوش حالی پر خوشی ہوتی ہے۔ خوب
ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ مگر فلکِ فتنہ ساز نے چین نہیں لینے دیا۔ وزیر
اور شاہ میں مخالفت ہو گئی۔ مولوی بنگالی کے سپرد جاسوسی ہوئی فلک نما
کا گھڑی گھڑی کا پرچہ کوتوالِ شہر کو پہنچائیں۔ لالچ بری بلا۔ پرچہ
نویسی منظور کر لی۔ پرچہ پکڑا گیا۔ بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے
ہم نکلے۔ پھر کسی نے بات نہ پوچھی۔ اگر آج کو لکھنا نہ آتا نوجوان بچ جاتی
اور مزے اڑاتے رہتے۔ بنگال چلے گئے۔ خدا معلوم گذر اوقات کی
کیا صورت رہی۔ کرزن دربار کے موقع پر یکایک مولوی بنگالی ہمارے
ہاں نمودار ہوئے۔ ہم سے ملنے آئے تھے شکستہ حال تھے۔ بہت
افسوس ہوا۔ رل جل کر چلے گئے۔ پھر ان کی صورت دیکھنی نصیب نہیں
ہوئی۔

سر شاہ سلیمان

(۱۷)

ابھی قبر میں ان کا کفن بھی میلا ہونے نہیں پایا کہ ان کے بارے میں لکھنے کی باری آگئی۔ اب تک جن کے اذکار ہوئے ہیں۔ قبروں میں اُن کی ہڈیاں تک شاید گل گئی ہوں گی۔ ابھی چار دن کی بات ہے۔ چھ برس آنکھیں بند کرتے گذر گئے۔

روز حاجی عبدالغفار مرحوم (منیجر کوٹھی حاجی علی جان) کی محفل میں ان کے تذکرہ ہوتے تھے۔ اب نہ یہ رہے نہ وہ رہے شاہ سلیمان آنے والے ہیں۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔ بڑے بڑے باپوں کے بیٹے ہیں۔ لیاقت کا جواب نہیں۔ وہ آئے سارے دہلی کے حکام پرست اسٹیشن پر لینے گئے۔ کوٹھی تک پہنچایا۔ وہاں چائے پانی کی دعوت کھائی۔ جو ملا ان کے حُسن و خُلق کو سراہتا ہوا ملا۔ مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ہم گوشہ نشین میر و سلطان کی جناب میں جانا ہمارا وطیرہ نہیں۔ ہاں ضرورت پڑے تو دوسری بات ہے شاید یہ دُنیا سے رخصت بھی ہو جاتے اور ہم کو ان کے دیدار نصیب نہ ہوتے۔ حسنِ اتفاق اور چیز ہے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ عرض کئے

دیتا ہوں۔

سر عبداللہ سہروردی بسین بابو رجسٹرار سے ملنے دہلی یونیورسٹی میں آئے ہوئے تھے۔ ہم بسین بابو کے پُرانے یار۔ مشن کالج میں بیس برس تک ساتھ پڑھایا۔ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ اتفاقاً وہاں جانکلے۔ ہم اُتر رہے تھے۔ اور بسین سہروردی کو سوار کرارہے تھے۔ انہوں نے میرا تعارف کرایا۔ مَیں تو بھول بسر بھی گیا۔

آپ کو تعجّب ہوگا۔ میں کسی سے اپنا تعارف کرانا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری سرچوٹ ہے۔ اس میں جس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کی تذلیل کا شائبہ ہوتا ہے۔ وہ ادنیٰ ہے اور دوسرا اعلیٰ۔ یہ اِس خاکسار کو گوارا نہیں۔ مگر موقع بے موقع تعارف ہو ہی جاتا ہے۔ ہر شخص کو اس کی کیا خبر۔ مجبور ذلّت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ ایک سال بعد۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نوکر نے اطلاع کی۔ کوئی صاحب آئے ہیں۔ ملنا چاہتے ہیں نشست کے کمرہ میں بٹھا دیے گئے۔ میں حاضر ہوا۔ دل میں یہ خیال کہ کوئی دُکان یا مکان کرایہ پر لینے آیا ہوگا۔ مجھ بے نام ونشان کے پاس خواہ مخواہ کون آ کے اوقات ضائع کرے۔ پھر سب سے بڑا دُکھ پیٹ کا۔ ہر وقت یہی پیشِ نظر۔

ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا۔ جناب۔ سر عبداللہ سہروردی کے

سکریٹری ہیں۔ اُن کے فرستادہ تشریف لائے ہیں مطلب یہ کہ وہ اِس گدائے متکبّر سے ملنا چاہتے ہیں۔ مَیں نے عرض کی جب چاہیں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ عاجز ہر وقت غریب خانہ پر موجود رہتا ہے۔ یہ سُنکر سکریٹری صاحب کچھ ہکّا بکّا سے ہو گئے۔ مدّعا یہ تھا۔ بندہ پیغام پاکر اُن کی جناب میں حاضر ہو۔ اِن سے اُن کی کوٹھی کا پتہ دریافت کرلے۔ چنانچہ اوروں سے یہ معلوم ہوا۔ اُن کے ساتھ یہی کارروائی عمل میں آئی اور وہ حاضر بھی ہوئے۔ تھوڑی دیر یہ صاحب خموش سر بہ گم بیٹھے رہے۔ پھر سر اُٹھاکر فرمایا۔ کیا جواب عرض کروں۔ اب میں ان کا مطلب سمجھا۔ میں نے کہا میں تو جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کرچکا۔ بس یہی جواب ہے۔ میں جان گیا۔ آنا جانا کیسا وہاں تو دربارداری کرانی مقصود ہے۔ میں چُپ کئے والا کب۔ اتفاق سے تھوڑے ہی دن بعد ایک پارٹی میں نظر پڑ گئے۔ فوراً اُن کے پاس جا موجود ہو۔ اور شکایت کے لہجہ میں کہا۔ جناب بھی خوب آدمی ہیں۔ لوگوں پاس آدمی بھیجتے ہیں تشریف لانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اُن سے انتظار کراتے ہیں۔ پھر آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ اس غریب کی سٹّی سی گم ہو گئی۔ کچھ جواب بن نہ پڑا۔ تعجب اِس پر ہوتا ہے کہ ان بڑے بڑے آدمیوں کو ہم جیسے گم نام لوگوں کے نام برسوں تک کیسے یاد رہتے ہیں کہ دربار داری

کے لئے طلب فرماتے ہیں - خیر یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ تھی - اب آگے سُنئے -

چند سال ہوئے لالہ سری رام - اب سر سری رام - میرے قدیم عنایت فرما کا ایک تجارتی وفد کے سلسلہ میں کابل جانا ہوا - وہاں اہلِ کابل سے ملاقات ہوئی - بہت آؤ بھگت ہوئی - مہماں نوازی کا حق ادا ہوا - یہ ان لوگوں کا شیوہ ہے - دوسرے سال دولتِ افغانستان کے محکمۂ تجارت کے وزیر دہلی تشریف لائے - انہوں نے ان کو پارٹی دی - میرے پاس بھی دعوت نامہ آیا - مراسم قدیم کی بنا پر جانا ضرور ہوا ورنہ شکایت اور باز پُرس ہوتی - عذرِ مقعول پیش کئے بغیر چھٹکارا نہیں عذرِ لنگ نامقبول -

موٹر سے اُترا تو خود بدولت گیٹ پر کھڑے ہیں مجھے ساتھ لے کر چلے - میں نے کہا بھی آپ کھڑے رہیں اور مہمان آرہے ہیں میں چلا جاؤں گا - کہنے لگے - مجھے آپ کو امتیازی جگہ لیجا کر بٹھانا ہے میرا یہ طریقہ نہیں - میں تو ادنیٰ آدمی ہوں - اپنے مرتبہ سے آگے قدم نہیں رکھتا - نہ دوڑ چل نہ پھسل پڑ - بلکہ میں تو امتیازی نشست کا سخت مخالف ہوں - مہمان سب برابر امتیاز کا ہے کا - مگر ہماری معاشرت کی عجیب حالت ہے - ہم کو یہ لایعنی حرکت ناگوار ہی نہیں گذرتی

خیر اس قصہ کو جانے دیجئے۔

میں نے سری رام سے انکار کیا۔ اُنہوں نے وجہ یہ بیان کی۔ کابل سے جو مہمان تشریف لائے ہیں اُن کو نہ انگریزی آتی ہے نہ اردو تو اُن کے پاس بیٹھ کر فارسی میں بات چیت کر۔ وجہ معقول تھی میں راضی ہو گیا۔ اس امتیازی مقام پر شاہ سلیمان بھی تھے۔ میں اُن کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ شاید اخبار میں تصویر دیکھی ہو۔ وہ مجھ جیسے کو یاد کیا خاک رہے۔ سلجوقی صاحب سفیر کابل بھی وہیں میرے برابر بیٹھے تھے ان کو میں نے ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر بات چیت کا موقع نہ تھا۔ دیر تک سب سے گفتگو ہوتی رہی۔ معلوم نہیں سر سلیمان کو میری کیا ادا پسند آئی۔ اپنی کُرسی پر سے اُٹھے۔ کوئی چار کُرسیوں کا فاصلہ طے کر کے میرے سامنے آن کھڑے ہوتے۔ میں قرینہ سے سمجھ گیا کہ وہ شاہ سلیمان ہیں۔ بہت تپاک سے ملے۔ میری نسبت بہت کچھ استفسار فرمایا۔ اس دن کے بعد پھر جہاں کہیں نظر آئے۔ فوراً مجھ سے آ کر ملتے اور بہت خلوص سے ملتے۔ میں پھر بھی کبھی اُن کے دولت خانہ پر حاضر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ غریب چل بسے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خان بہادر سیّد علی حسن اِٹاوے والے۔ سر سلطان احمد خان گوالیار والے

سر علی اِمام پٹنہ والے۔ سر سنکران ایار مدراس والے

(۱۸)

خان بہادر سیّد علی حسن - والد کے بڑے دوست۔ ہم پیالہ ہم نوالہ برسوں کا ساتھ۔ رات دن کی نشست۔ مولوی مہدی علی خان محسن الملک کے چچا زاد بھائی محسن الملک والد کے محسن - اِدھر والد کی حیدر آباد سے پنشن ہوئی اُدھر اُن کا اخراج عمل میں آیا۔ اقبال الدولہ بہادر کی وزارت کا زمانہ ہے - یہ اُن کے عقلِ کُل ہیں۔ اعلیحضرت حضورِ نظام اور وزیر میں اَن بَن ہو گئی - نزلہ سیّد علی حسن پر گرا۔ وجہ معقول تھی - ان کی اکلوتی صاحب زادی کی شادی ہو رہی ہے۔ بس نکاح بندھنے کی دیر ہے۔ ایک دم خارج البلد۔ سید ھے پولیس کی نگرانی میں اسٹیشن پر چلے جاؤ۔ اور ریل پر سوار ہو جاؤ۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔

ان کا ہر سال دہلی آنا ضرور۔ دس پندرہ دن قیام رہے گا۔ ہم پہلے مشن کالج کے طالب العلم۔ پھر پروفیسر۔ جب یہ تشریف لائیں باوا کی طرف سے اے۔ ڈی۔ سی کا عہدہ ہمارے سپرد ہو۔ جہاں

جائیں لے جائیں۔ جو کام خدمت کو فرمائیں کرو۔ ان کو اہلِ جاہ و مرتبہ کی پرستش کا لپکا۔ ہر ذی مرتبہ شخص سے ملیں گے۔ کسی نہ کسی طرح روشناسی حاصل کریں گے۔ اس زمانہ میں بیکار۔ معاش کی جانب سے متفکر۔ ہر طرف ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ کاغذ کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ تنکے کا سہارا تکتے ہیں۔ اعلیٰحضرت نظام کی خدمت میں سید حسین بلگرامی کی معرفت معروضہ گزرانا ہے۔ تصدقِ فرقِ مبارک کی استدعا ہے جب موقع اور محل ہوگا پیش ہوگا۔ ریاستِ جاورے میں ملازمت کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ ابھی ملی نہیں۔ تھوڑے دن بعد سب کچھ ہو جائے گا۔

سلطان احمد خاں نے دہلی میں کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ زیرِ تعمیر ہے کچھ کمرے تیار ہو گئے ہیں۔ وہاں جا رہے ہیں۔ میم صاحب ساتھ ہیں۔ بیرسٹری کرتے ہیں۔ یہ ہم کو ساتھ لے وہاں جا اُترے۔ غالباً پہلا تعارف ہوگا۔ ہم کس گنتی میں۔ اس زمانہ میں طالب العلم۔ پھر کچھ لگو کی حیثیت سے سیّد صاحب کے ساتھ ہماری قدر و منزلت کہاں۔ چائے کا وقت تھا۔ چائے آئی۔ بس قابلِ ذکر یہ بات ہے۔ میم صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے بنا کر دی۔ ہمارے سیّد صاحب نے تعریف کے پُل باندھ دیئے گویا ایسی لذیذ چائے کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ میم صاحب کی مسرت قابل دید تھی۔ مُنھ اُٹھا اُٹھا کر اور اکڑ اکڑ کر شوہر نامدار

کیطرف دیکھتی تھیں کہ میں بھی کچھ ہوں۔ یہ نسائی خفّتِ عقل کا لاجواب منظر تھا۔ ہم کو بھی ایک پیالی ملی۔ مگر کچھ بے اعتنائی سے بدمزا معلوم ہوئی۔ ان میاں بیوی سے نفرت سی ہوگی۔ چچا صاحب نواب ننّھے خانصاحب سے ان کے بہت مراسم تھے۔ باوجود اس کے میں پھر کبھی نہیں ملا۔

ایک سال اسی دورانِ آمدورفت میں مجھے ساتھ لے سر علی امام سے جا ملے۔ اب میں کالج میں فارسی پڑھا رہا ہوں۔ کالج کی استادی بھی کوئی خدمت ہے۔ استادوں کا کون پُرسانِ حال ہوتا ہے۔ لونڈے پڑھانا بھی کوئی کاموں میں کام ہے۔ تاہم سر علی امام بہت عزّت واحترام سے پیش آئے جرأت ہوئی ہمت بڑھی۔ بار بار ملنے کو جی چاہا۔ ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آئے ایک دو بار بہ خندہ پیشانی۔ موقر قانونی مشورہ بھی دیئے۔

اب ان کا زمانہ ملازمت ختم ہونے آ لگا۔ وائسرائے کی کونسل کی تعلیمی ممبری پر سر سنکران ایار کا تقرر ہوا۔ میں علی امام سے الوداعی ملاقات کو حاضر ہوا۔ سیسل ہوٹل میں مقیم تھے۔ گاڑی پر سے اُترتا ہوں تو وہ سامنے سے سر سنکران کو ساتھ لئے آرہے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ ٹھہر گئے اور سر سنکران سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے کمرہ میں بیٹھنے کو فرمایا۔ خود سنکران کو گاڑی تک چھوڑ کر واپس آئے۔

اسی زمانہ میں دہلی ٹینس کلب نے ان کو الوداعی پارٹی دی کسی اللہ کے بندہ نے ہم کو بھی کارڈ بھیجدیا۔ شاید انہوں نے ہی بھیجا ہو۔ وہاں سر سنکران بھی مدعو تھے

لمبے تڑنگے۔ بھدے۔ بیڈول۔ کج خُلق۔ کج ادا۔ نو وارد شتر بے مہار کی طرح مارے مارے پھر رہے ہیں۔ انہیں جانے تو کون جانے اور ملے تو کون ملے۔ مجھے ترس آیا تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ پاس جا کھڑا ہوا۔ بات چیت کرونگا۔ ان کا دل بہلاؤنگا۔ میں نے سلام کیا۔ بری نظر سے میری طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہہ رہے ہیں تو کون کیوں ہمارے پاس آیا۔ میں نے عرض کی سر علی امام نے میرا آپ سے تعارف کرایا ہے۔ اس پر بھی انکے کان پر جوں نہیں چلی۔ بھیانک بھیانک نظروں سے دیکھتے ہی رہے۔ مجھے سخت ناگوار ہوا۔ بیٹھ موڑ ایک کہی نہ دو۔ اپنے دل میں خفیف ہو چلدیا کسی اور سے بات چیت کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مُڑ کر جو دیکھتا ہوں۔ حضرت اُونٹ کے اُونٹ کھڑے ہیں۔ مجھسے معافی چاہی اور گھر پر آنے کو ارشاد فرمایا۔ پھر بار بار ملاقات ہوا کی۔ کج خُلقی طبیعی تھی۔ مگر میرے ساتھ نہیں۔ اکثر فرماتے تھے۔ سوائے تیرے کوئی ایسا نہیں آتا جو بے غرض ہو۔ جو آتا ہے غرض لیکر آتا ہے۔ تجھ سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ خود بھی بغیر میرے بُلائے گھر پر آئے۔ شاید اُس پہلی حرکت کی تلافی مقصود ہو۔

ایک قصہ جو ان کی زبانی سُنا گوش گزار کرتا ہوں۔

سرزمین کرناٹک بعثت سے پہلے سے عرب تاجروں کی گزرگاہ رہی ہے۔ انکی وہاں نوابادیاں موجود تھیں۔ رسولِ اکرمؐ کا عربوں نے وہاں چرچا کیا۔ اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ راجہ تک دعوت پہنچی۔ اُس نے اسلام قبول کیا۔ اپنی مملکت میں پانچ مسجدیں تعمیر کرائیں پانچ امام مقرر کئے۔ یہ ابتک بقولِ سنکران موجود ہیں اور ملک میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پھر وہ نیک بندہ عازم ملکِ عرب ہوا۔ تا صحبت بابرکت سے فیضیاب ہو۔ اِسکے بعد اُسکی

سولہ نہیں معلوم بعد

حسن۔علی۔احمد ابنائے عبداللہ

(۱۹)

ان کا ذکر احسان مندی کا اقتضا ہے۔ ورنہ تینوں مر کھپ گئے۔ کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔ ایک زمانہ تھا۔ عرب ترکِ وطن کرتے۔ ہمارا دیس بساتے۔ علیٰ قدرِ مراتب مناصب پاتے۔ پردیسیوں کی رو اکبر اعظم کے وقت تک جاری رہی۔ پھر فوج راجپوتوں کی ہو گئی۔ اجنبیوں کی قدر افزائی کم۔ اس کا اچھا برا کیا نتیجہ ہوا۔ یہ تاریخی بحث ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ تاہم عربوں کی آمد صوبجات میں قائم رہی۔ یہ خاندان اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ تینوں عبداللہ کے لڑکے عربی الاصل شکل وشمائل میں عرب کی چھینٹ نہیں۔ آب و ہوا کا اثر۔ خلط کا نتیجہ۔ عادات میں عرب کا انداز نمایاں ہے۔ سخاوت عرب کی۔ مہماں نوازی عرب کی۔ خلق عرب کا۔

بڑے بھائی حسن بن عبداللہ۔ کالے کلوٹے۔ لمبے تڑنگے۔ بدن پر بوٹی نہیں۔ دونوں چھوٹے بھائی گورے چٹے۔ میانہ قامت بھرے ہوئے بدن۔ اختلافِ بطن کا نتیجہ۔

حسن بن عبداللہ صدر محاسبِ سرکارِ عالی۔ ہمارے بادا

اُن کے مددگار۔ گھر آمنے سامنے۔ ان کی عالیشان کوٹھی۔ ہمارا چھوٹا سا مکان۔ کوٹھی میں باغ سرسبز و شاداب۔ کوئی عجیب بات نہیں۔ دکن کی آب و ہوا کا طفیل ہے۔ یہاں گُل بوٹے پر برس کے بارہ مہینے بہار ہے۔ پانی وافر۔ لُو کا نام و نشان نہیں جو جُھلس دے۔ نہ جاڑا پالا جو پالا مار جائے۔ زمین ایسی کہ سال میں تین فصلیں دے۔ ہاں اثمار کو سرزمین نامُساعد۔ ان کی تُرشی تُرش آبہ پر طعنہ زن ہے۔ ہماری نو دس برس کی عمر۔ باغ اور کوٹھی میں رات دن کا رہنا۔ مالکِ خانہ کے پیارے۔ نوکروں کی کیا مجال جو روک ٹوک کر سکیں۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ نیا ڈسک اور اُس کے ساتھ کی کرسی آئی ہے۔ ڈشائی نے بنائی ہے۔ یہ کارخانہ مدراس میں ہے۔ نظر فریب گھاٹ ہے۔ تیاری اُس سے بھی افضل۔ حسن صاحب والد کو میز دکھا رہے ہیں۔ قیمت پانسو بتاتے ہیں۔ ہم بھی جا پہنچے۔ دیکھ کر فرمانے لگے۔ میاں خوب پڑھنا لکھنا۔ نہیں تو ہم ہی جیسے ٹھوٹ رہ جاؤ گے۔ دیکھو ڈسک کیسا اچھا ہے۔ مگر ہمیں پڑھنا لکھنا تو آتا ہی نہیں (واقعہ بھی یہی تھا۔ یہ تینوں بھائی بہت سی زبانیں بول سکتے تھے۔ مگر بہت کم پڑھ لکھ سکتے تھے) باوا نے عرض کی پڑھنا لکھنا کیا چیز ہے۔ خدا آپ کا سا نصیبہ کرے۔ جواب ملا نصیبہ بھی

جب ہی اچھا لگتا ہے جب ہاتھ میں ہنر ہو۔

انہوں نے مُناکحت میں کوتاہی نہیں کی۔ پھر بھی لاولد۔ آخر ایک کرنیل صاحب کی مس صاحبہ کے جال میں پھنس گئے۔ ترکِ ملازمت کی یسفرِ ایران اختیار کیا۔ وہاں ملازمت کا ارادہ تھا۔ دریا میں رقیب دیو سیرت تیرِ قضا بن کر نمودار ہوا۔ تازی خون تاب نہ لا سکا۔ غرقاب ہوئے۔ مصرع۔

زِ رقیبِ دیو سیرت بخدائی پناہم۔

اب دوسرے بھائی کا حال سُنئے۔ اب ہم پہلے مکان میں نہیں رہتے۔ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ ہماری سواری میں گھوڑا ہے۔ کم قیمت ادنیٰ درجہ کا۔ ہم سواری کے بڑے شوقین۔ بچپن سے سوار ہوتے چلے آئے ہیں۔ پاس ہی علی بن عبداللہ کی کوٹھی ہے۔ یہ افزائشِ نسلِ چوپایاں کے افسر ہیں۔ سارے سرکاری گھوڑے یہی خریدتے ہیں۔ سال بھر میں بمبئی کے تین تین چار چار چکر ہوتے ہیں۔ قسم قسم کے گھوڑے لاتے ہیں۔ صرفِ خاص اور دیوانی میں داخل کئے جاتے ہیں۔ دیہات میں بھیجے جاتے ہیں۔ افزائشِ نسل میں کام آتے ہیں۔ گھوڑے کی ان کو بڑی نگاہ ہے۔ شاہ سوار بھی ہیں۔ گھر میں ایک میم صاحب ہیں۔ ہمیں اتنا شعور نہ تھا کہ بتا سکیں۔ یورپین تھیں

یا دو غلی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا ہے۔ پری تمثال۔ ہمارا
ہم عمر۔ اس کی سواری کے لئے بھی گھوڑا ہے۔ اس کے مقابلہ میں
ہمارا جانور گدھا ہے۔ ہم دونوں میں بہت الفت ہے۔ شام کو ساتھ
ہواخوری کو نکلتے ہیں۔ آپس میں آمدورفت بھی ہے۔ میم صاحب ہمیں
بہت چاہتی ہیں۔ انگریزی مٹھائیاں کھلاتی ہیں۔ ہم ان کے اکلوتے
بچّہ کے ہمجولی ہیں۔ خدا کی قدرت بچّہ کو تین دن بخار آیا اور رخصت
ہوا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا۔ ہمیں بھی رنج ہوا۔ دن بھر مُنہ
لپیٹے پڑے رویا کئے۔ باوا کا حکم ہوا۔ تو ان کے ہاں اکثر جایا کر ان کا
دل بہلے گا۔ حکم کی تعمیل کی آمدورفت بڑھا دی۔ صاحب اور میم صاحب
بھی زیادہ التفات کرنے لگے۔ عؔلی نے ایک دن باوا سے کہا۔ میرا
دل چاہتا ہے کہ گھوڑا تمھارے بچّہ کو دے دوں۔ اُنہوں نے
بلاقیمت لینے سے انکار کیا۔ وہ بہ قیمت دینے پر رضامند ہو گئے
قیمت نام چار کو تھی۔ گھوڑا تو مفت دیا تھا۔ کیا لیا۔ تین سو یا چار سو
خالص نجدی عرب۔ گلدار سبزہ۔ جوڑ بندوں سے صاف۔ ایسا
ملے کہاں۔ یہ تو ہزاروں کو سستا ہے۔ غرض گھوڑا آ گیا نسب نامہ
ساتھ لایا۔ فروخت کے وقت ہم کو اُس پر بٹھایا گیا۔ اُس کو تلقین
کی گئی۔ یہ تیرے مالک ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں یاد ہے۔ گھوڑا سوکھی

گھانس کھاتا ہے اور سوکھے چنے۔ دن بھر سارے گھر میں ٹہل لگاتا رہتا ہے۔ کمروں میں گھس آتا ہے۔ روٹی ٹکڑا کھا جاتا ہے جلیبی اور لڈّو کا بڑا شوقین۔ بڑے سے بچّہ تک اُسے چھیڑیں کنوتی تک نہیں بدلتا۔ رات کو اگاڑی پچھاڑی کچھ نہیں بندھتی۔ تھان کے آگے ڈنڈا لگا دیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ میرے سگے ماموں کفایت اللہ خانصاحب اورنگ آباد سے تشریف لائے میں نے سواری کے لئے گھوڑا پیش کیا۔ وہ تیار ہو کر آیا۔ یہ سوار ہونے گئے۔ کسی عنوان سواری نہ دے پاچھی مارے۔ کمر کرے۔ کاٹنے کو دوڑے۔ جب عاجز آگئے تو ماموں صاحب شکایت لے کر میرے پاس آئے۔ مجھے بڑا تعجّب ہوا۔ لو آج گھوڑا دیوانہ ہو گیا۔ مَیں نے تو اس کی ان سے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کا اُلٹا ظہور میں آیا۔ باہر نکلا تو دیکھتا کیا ہوں کہ عادت کے موافق چُپ چاپ کھڑا ہے۔ پاس گیا چُمکارا اور اپنے سامنے اُن کو سوار کرا دیا۔ چپکا کان دبائے چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ سواری کے واسطے مالک کی اجازت کی ضرورت تھی۔

اسی اثنا میں صدر محاسب مقرّب جنگ بہادر مقرّر ہوئے۔ بڑے خاندانی تھے اور بہت شریف مگر کانوں کے کچّے۔

حاسدوں نے کان بھر دئے۔ آپس میں دشمنی ہوگئی۔ والد نے ترکِ ملازمت کا ارادہ کرلیا۔ ہم کو اور ہماری ماں کو پہلے روانہ کردیا۔ پھر خود مال و اسباب فروخت کرکے دہلی آگئے۔ اسی رواروی میں ان کی شرعی جوڑی اور ہمارا گھوڑا کوڑیوں کے مول بک گیا۔ ارادہ یہ کہ چھ ماہ تک رخصت پر رہیں گے۔ پھر پنشن کی درخواست کر دیں گے۔ یا قسمت یا نصیب جتنی لکھی ہوگی مل جائے گی۔ مگر ع :-

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ دو مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ مقرّب جنگ علیحدہ کر دئے گئے۔ والد دن دناتے ہوئے نوکری پر حاضر ہوگئے۔ گھوڑا ہاتھ سے جا چکا تھا۔ پھر کبھی اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ خدا جانے کہاں گیا۔

تیسرے بھائی احمد بن عبد اللہ۔ ان سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ فوج میں کپتان تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ممکن ہے کسی لڑکی کی اولاد باقی ہو۔ ع

تازہ ہے یاد اور زمانے گذر گئے

تمّت